اردو ادب

اردو گھر

انجمن اسلام

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مشاورتی مجلس
(بمبئی یونیورسٹی کے ضابطے کے مطابق)

صدر

ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا

●

چیرمین

جناب رضوان حارث

●

سیکریٹری

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

●

اراکین

جناب عبدالمجید ای پالکا — جناب عبدالستار زری والا

پروفیسر اے اے قاضی — جناب عبدالعظیم کھتکھٹے — ڈاکٹر شفیع شیخ

● ● ●

مجلس عاملہ

صدر

ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا

●

نائب صدر	نائب صدر	نائب صدر
جناب رضوان حارث	محترمہ ہما پیر بھائی	جناب عزیز احمد بھائی

معتمد اعزازی — جناب عبدالمجید ای پالکا

خازن اعزازی — جناب یوسف دلال

شریک معتمد — جناب عبدالستار زری والا

شریک خازن — جناب ایس اے قادری

اراکین

جناب سمیع خطیب	محترمہ زلیخا مرچنٹ	جناب سعید دادرکر
جناب احمد آر پیر محمد	جناب رضوان فاروقی	جناب غازی شیخ
جناب احمد پیر محمد	ڈاکٹر علی قاضی	جناب عبدالعظیم کھتکھٹے
ڈاکٹر غفار خان	پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر	ڈاکٹر اے ایف بی بھاریا

● ● ●

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام سے تا حال ڈائرکٹران

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (۱۹۴۷ سے ۱۹۶۸)

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی (۱۹۶۹ سے ۱۹۷۵)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر (۱۹۷۵ سے حال)

نوائے ادب بمبئی

ششماہی

•

مدیر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

•

جلد ۴۷ — شمارہ ۱

اپریل ۱۹۹۷ ع

•

مندرجات

مودبانہ التماس

قلمکاروں سے استدعا ہے کہ وہ اپنے

مضامین یا مقالے

نوائے ادب

میں بغرض اشاعت ارسال فرمائیں

مدیروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے

رسائل و جرائد

مقالہ نما

میں شمولیت کی غرض سے بھیجیں

ناشروں سے اپیل ہے کہ وہ اپنی

تصانیف و تالیفات

کتابی دنیا

میں برائے تبصرہ ارسال کریں اور

اردو دوستوں سے گذارش ہے کہ وہ اپنا

سالانہ چندہ

بھیجکر

نوائے ادب

کی سرپرستی قبول فرما کر شکریہ کا موقع عنایت کریں

نظام الدین ایس گوریکر

(مدیر)

احوال واقعی

اردو نمبر :

امسال اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (بمبئی) کے قیام کو پچاس سال پورے ہوگئے اور اس زریں موقع پر ہم انسٹی ٹیوٹ کا ترجمان "نوائے ادب" کے موجودہ شمارہ کو "اردو نمبر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور یہ خصوصی پیش کش ہم اپنے قارئین کرام کی خدمت میں نذر کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اردو انسٹی ٹیوٹ اور نوائے ادب :

شہر بمبئی کے دیگر تحقیقی اداروں کی طرح انجمن اسلام کا اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھی حکومت کی اجازت اور یونیورسٹی کی منظوری سے اپنی خدمات اپنے طور پر اردو زبان و ادب کے تعلق سے نہ صرف مہاراشٹرہ میں بلکہ جنوبی ہندوستان میں بحسن و خوبی انجام دے رہا ہے۔ ایک طرف اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کی خاطر طلبہ کی رہنمائی کررہا ہے تو دوسری جانب ایک تحقیقی مجلہ کی اشاعت کا خاطر خواہ اہتمام کرتا ہے۔ اس ادارہ کے زیر نگرانی نو طالب علموں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرلی ہے اور ۱۹۸۲ ع سے قبل سینکڑوں طلبا و طالبات بمبئی یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ یونیورسٹی میں اردو شعبہ کے قیام کی وجہ سے ہماری انسٹی ٹیوٹ میں اب صرف پی ایچ ڈی کی ڈگری کا داخلہ ہورہا ہے اور فی الحال یہاں تین طلبہ کے نام درج رجسٹر ہیں۔

ہمارے طلبہ کے تین ڈاکٹریٹ کے مقالے زیور طبع سے منصۂ شہود پر آچکے ہیں اور دو زیر طباعت ہیں۔

ہماری انسٹی ٹیوٹ کا ترجمان "نوائے ادب" اپنی زندگی کے ۴۷ ویں سال میں قدم رکھ رہا ہے اور تین سال بعد اس تحقیقی مجلہ کے پچاس سال پورے ہوجائینگے۔

مقام مسرت ہے کہ یہ اردو جریدہ اپنے معیار کی بدولت نہ صرف ہندوستان کے علمی حلقوں اور تعلیمی اداروں میں مقبول ہے بلکہ دنیا کے مختلف ملکوں میں بالخصوص انگلستان، امریکہ، مصر، بنگلہ دیش، پاکستان، افریقہ اور اسلامی ممالک میں اس کی پذیرائی ہورہی ہے۔ ابتدا میں یہ سہ ماہی تھا لیکن اچھے مقالوں کی کم یابی کی وجہ سے اور طباعت اور کاغذ کی گرانی کے باعث اسے ششماہی کردیا گیا ہے اور ۱۹۷۶ء سے باقاعدہ سال میں دو مرتبہ اردو ٹائپ میں شائع ہورہا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آمدنی کے ذرائع محدود ہونے کے باعث انسٹی ٹیوٹ کی مالی حالت بہت کمزور ہے تاہم محترم سیف طیب جی صاحب، بیرسٹر عبدالرحمٰن انتولے صاحب، بیرسٹر اکبر پیر بھائی صاحب، جناب عبدالقادر حافظکا صاحب اور جناب معین الدین حارث صاحب نے اپنے دوران صدارت میں اس ادارے کی دل کھولکر مدد کی اور ہمارے موجودہ فعال صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب اس ادارے کے فروغ و ترقی میں ہر امکانی کوشش اور ہر ممکنہ تعاون دے رہے ہیں۔

اس ضمن میں ہم اپنے اولین ڈائرکٹران میں سید پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب (۱۹۴۷ء۔۱۹۶۸ء) اور ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی صاحب (۱۹۶۹ء۔۱۹۷۴ء) کی خدمات کو فراموش نہیں کرسکتے۔ انہوں نے اسماعیل یوسف کالج (جوگیشوری) کے شعبۂ اردو کے سربراہ ہونے کے ساتھ یونیورسٹی کی منظوری سے اعزازی طور پر ڈائرکٹر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دی ہیں اور ۱۹۷۵ء سے سینٹ زیویرس کالج (بمبئی) کے اردو، فارسی اور اسلامیات کے استاد پروفیسر گوریکر صاحب کو محترم بیرسٹر پیر بھائی صاحب نے حکومت کی اجازت اور یونیورسٹی کی منظوری سے انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی ڈائرکٹر کی حیثیت سے تقرر کرالیا۔

اسی طرح کتابداروں میں خصوصی طور پر جناب فضل اللہ فاروقی صاحب جناب حامداللہ ندوی صاحب، جناب ندیم نعمانی صاحب اور جناب شفیق ڈانگے صاحب کے بھی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنی خدمات بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیں اور انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری کو صحیح معنوں میں ایک دارالمطالعہ کی

شکل دی۔ ہمارے انسٹی ٹیوٹ میں ان کے دوران کتابداری میں تقریباً سو سوا سو طلبہ کا داخلہ ہوتا تھا اور اب مشکل سے دس طالب علم بھی درج رجسٹر نہیں ہوتے۔ آجکل مسز نجمہ عثمان صاحبہ کتابدار کی حیثیت سے وابستہ ہیں تحسین واگھو صاحبہ اور محمودہ خان صاحبہ لائبریری میں مددگار کے طور پر اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

علاوہ ازیں حکومت ہند کی سرپرستی میں اردو خطاطی کا مرکز بھی اس انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام تقریباً تیس سال سے چل رہا ہے اور سینکڑوں طالبعلموں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد خطاطی کے پیشہ کو اپنایا ہے اور ہندوستان کے علاوہ اسلامی ممالک میں برسر روزگار ہیں۔ اس ضمن میں جناب عبد الرحمٰن شیخ صاحب صدر خطاطی مرکز کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ وہ اپنے فرائض بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر:

کل ہند اورینٹل کانفرنس نے اپنے ۳۸ویں اجلاس (منعقدہ کلکتہ ۔ ۱۹۸۶ ع) میں ڈاکٹر این ایس گوریکر صاحب کو ۳۹ویں اجلاس کیلئے « جنوب مشرقی ایشیائی اسٹڈیز » شعبہ کا صدر منتخب کیا ہے اور حال میں کل ہند میر اکادمی نے گوریکر صاحب کو « افتخار میر » اور بھارتیہ لوک دھارا ساہتیہ و کلا اکادمی نے آپکو « ساہتیہ رتن » جیسے اعزازات سے نوازا ہے۔

عالی مرتبہ مدھیہ پردیش کے گورنر ڈاکٹر شفیع قریشی:

ہمارے صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب کی دعوت پر ڈاکٹر شفیع قریشی صاحب نے احمد زکریا ہال کا افتتاح کیا اور بعد میں انجمن کی عوامی درسگاہ (پنچ گنی) کی ساٹھ سالہ خدمات پر مبارکباد دی اور انجمن کے سوا سو سال کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا اور ہدیۂ مبارکباد پیش کی ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب نے اپنے صدارتی خطبہ میں انجمن کے غیر فرقہ وارانہ کردار پر روشنی ڈالی اور کہا کہ یہ ادارہ نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ اہلیانِ ملک کی ہر ممکن

مدد کررہا ہے اور مزید یہ کہا کہ انجمن اسلام در حقیقت علیگڑھ یونیورسٹی کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ جناب عبدالمجید پالکا صاحب (جنرل سیکرٹری) نے شکریہ ادا کیا اور عصرانہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر اظہر دہلوی کی تشریف آوری:

سال رواں کے فروری اور مارچ کے دوران جامعہ اردو (علیگڑھ) کے وائس چانسلر ڈاکٹر خلیق انجم صاحب، انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد صاحب اور شعبۂ فارسی جواہر لال نہرو یونیورسٹی (دہلی) کے صدر ڈاکٹر اظہر دہلوی صاحب نے ہمارے انسٹی ٹیوٹ میں تشریف لاکر ہماری حوصلہ افزائی کی۔ گوریکر صاحب نے "نوائے ادب" کے شمارے پیش کرکے ان کو خوش آمدید کہا اور شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ آئندہ جب بمبئی میں وہ تشریف لائینگے تو انجمن کے جلسوں میں شریک ہوکر اپنے خیالات کا اظہار کرکے ہمیں محظوظ کرینگے۔

امید بلکہ یقین ہے کہ انجمن اسلام کے ہر دلعزیز صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب اور مجلس منتظمہ انسٹی ٹیوٹ کے فروغ و ترقی میں ممکنہ مدد دے کر ادارے کو مہاراشٹرہ کے دوسرے تحقیقی اداروں کی صف میں لا کھڑا کرینگے۔

نظام الدین ایس گوریکر
(مدیر)

اقبال کی نظم (خضرِ راہ) کا تجزیاتی مطالعہ

از

جناب بدیع الزماں، ہارون نگر، ورسٹ سیکٹر، پھلواری شریف، پٹنہ۔۸۰۱۵۰۵

اقبال فہمی کے لئے قاری کو تین باتوں پر عبور ہونا چاہئے ورنہ وہ کلام اقبال کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا۔ ایک تو یہ کہ وہ قرآن کے اُردو ترجمے اور سارے قرآنی قصوں پر حاوی ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر اقبال کے عہد تک تاریخ اسلام کے چھوٹے سے چھوٹے واقعہ سے لے کر بڑے سے بڑے واقعات اور جنگوں کی پوری تفصیل اور اُن واقعات اور جنگوں کے نتائج اور اُن سے منسوب شخصیتوں کے اوصاف و خصائص پر مکمل عبور رکھتا ہو۔ اور تیسرے یہ کہ وہ اقبال کے عہد سے کم از کم سو سال پہلے کے بین الاقوامی واقعات اور عالم اسلام میں اُن سے رونما ہونے والے نتائج سے کماحقہ واقف ہو۔ اقبال کے کسی بھی مجموعہ کی کوئی نظم ہو اُنہوں نے اِن تینوں باتوں کا پورا پورا خیال رکھا ہے اور یہ قاری پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اُنہیں گرفت میں لانے کے لئے حوالے یا ماخذ تلاش کرے۔ اور اگر غزل ہے تو اُس میں جتنے اشعار ہیں وہ ان تینوں کے کہیں نہ کسی ذیل میں ضرور آتے ہیں اقبال نے اپنی ساری اصطلاحوں کا پس منظر بھی ان ہی تینوں کے خمیر سے تیار کیا ہے۔

اقبال کی تصنیف "بانگِ درا" کی نظم "خضرِ راہ" بھی کچھ اسی قبیل کی ہے جہاں ان تینوں موضوعات کی آمیزش اس کی ہر ذیلی نظم میں ملتی ہے جن کا مطالعہ اس مضمون کا موضوع ہے۔

سب سے پہلے تو سوال یہ ہے کہ اقبال نے اس نظم کا نام "خضرِ راہ" کیوں رکھا اور جو کچھ اُنہیں کہنا تھا اُسے حضرت خضر علیہ السلام کے جواب سے منسوب کیوں کیا؟ وہ خود بھی اتنی ساری باتوں کا جواب دے سکتے تھے۔ خضر کا لفظ اُردو ادبیات میں کئی معنوں میں مستعمل ہے۔ ایک معنی بھولے بھٹکوں کے رہنما کے ہیں۔ دوسرا درازیٔ عمر کے اور تیسرا وہ شخص جو خاص علم رکھتا ہو۔ خضر ایک پیغمبر کا نام ہے مگر قرآن میں ان کا نام کہیں نہیں آیا ہے۔

اس کا ذکر صرف ایک بار سورۃ الکہف ۱۸ کی آیات ۶۵ میں "ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ" کہہ کر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے کہ: "جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا" اور جن کی ملاقات دریا کے کنارے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی تھی جس کا ذکر اسی سورۃ کے رکوع ۹ میں کیا گیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سفر دریا کے کنارے خدا کے سے حکم ہوا تھا مگر کہاں ہوا تھا اس کی صراحت قرآن میں نہیں کی گئی ہے۔ اس بات کی تصدیق کہ یہ "بندہ" حضرت خضر علیہ السلام تھے تجرید بخاری شریف (اُردو) کے نمبر شمار ۱۰۲ کی روایت سے ہوتی ہے جس کے راوی حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ الکہف ۱۸ کے رکوع ۸ تا ۱۰ کی پوری تفصیل سنائی اور اس کی تصدیق کی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جس "بندے" سے ملاقات ہوئی وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ سورۃ الکہف ۱۸ کی متذکرہ بالا آیت ۶۵ میں خدا نے اپنے اس "بندے" کے متعلق یہ بھی فرمایا ہے کہ۔ "ہم نے (اُسے) اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا" اور یہ ملاقات اس لئے کرائی گئی تھی تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم کا امتحان ہو۔ چنانچہ اقبال کو اس نظم میں جو باتیں کہنی تھیں اُنہیں ایک ایسے شخص کی زبان پر رکھیں جسے قرآن میں "ایک خاص علم" عطا کئے جانے کی بات وارد ہوئی ہے اور چونکہ اس نظم میں بہت سے اہم نکتے ہیں اس لئے اقبال نے اس نظم کا نام "خضر راہ" رکھا اور سارا جواب تو خود دیا مگر اُسے حضرت خضر علیہ السلام سے منسوب کیا۔

اقبال نے یہ نظم "خضر راہ" ۱۹۲۱ ع میں لکھی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں پر پیہم دس بارہ سالوں سے، خصوصی طور پر ۱۲ ـ ۱۹۱۱ ع کی بلقان کی جنگوں میں سلطنت عثمانیہ کی شکست کے بعد سے، مسلسل آفاتِ ارضی کا نزول ہوتا رہا تھا۔ اقبال کا دل تو پہلے ہی سے مسلمانوں کی زبوں حالی پر خون کے آنسو روتا آرہا تھا۔ مگر جب پہلی عالمی جنگ (۱۸ ـ ۱۹۱۴ ع) کے خاتمہ پر پوری سلطنتِ عثمانیہ پر مغربی سامراجیوں نے قبضہ کرلیا، جس میں برطانیہ اور فرانس

پیش پیش تھے، یہاں تک کہ انہوں نے بچے کھچے ترکی پر بھی قبضہ جما لیا تو اقبال کے دل پر کوہِ غم ٹوٹ پڑا۔ ساری دنیائے اسلام مغربی سامراجیوں کی ٹھوکروں میں آگئی۔ ہندوستان سے لے کر اسپین کے ساحل تک بحیرۂ روم کے دونوں طرف کے سارے اسلامی ممالک پر شکست و ادبار کی گھٹائیں چھا گئیں، حتیٰ کہ مسلمان ان سامراجیوں سے رحم کی درخواست تک کرنے لگے۔ عربوں نے انگریزوں خصوصاً لارنس آف عربیہ، کے دامِ فریب میں آکر ترکوں سے نسلی تعصبات کی بنا پر غداری کی (دیکھیں «ضرب کلیم» کی نظم «اُمرائے عرب سے») حالانکہ یہ سارے عرب بحیرۂ روم کے دونوں جانب ترکانِ جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر انگریزوں اور فرانسیسیوں کے غلام ہوگئے یہ غلامی دوسری جنگ عظیم (۴۵ - ۱۹۳۹ ع) کے خاتمہ بلکہ اس کے کئی سال بعد تک رہی۔ بیت المقدس پر صلیبی پرچم لہرانے لگا کیونکہ اس دوران میں برطانیہ نے فلسطین پر قبضہ کرلیا تھا، دمشق پر فرانس کا اور بغداد پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ اور حجاز کا حکمراں برطانیہ کا وظیفہ خوار شریف حسین آف مکہ بن گیا۔ اس پہلی جنگ عظیم کے دوران ہی ۱۹۱۷ع میں روس میں اشتراکی انقلاب واقع ہوا جس نے یورپ میں طاقت کے توازن کے معاملے میں ایک نیا موڑ لے لیا جس کا اثر عالمِ اسلام پر بھی پڑا۔ اور پھر ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی تحریک آزادی کی آواز کو مدھم کرنے اور برطانیہ کے ذریعہ نام نہاد آئینی حقوق دیئے جانے پر بھی اقبال خوش نہ تھے۔ یہی ساری باتیں اس نظم «خضرِ راہ» کے رقم کئے جانے کی محرک بنیں اور یہی اس کا پسِ منظر ہے۔ اب ذیل میں اس کی ذیلی نظموں پر الگ الگ روشنی ڈالی جارہی ہے۔

شاعر

اقبال کے کلام کا ایک خاصہ ہے کہ وہ اپنی زیادہ تر نظموں میں جن نکتوں کو ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں اُنہیں ذہن نشین کرانے کے لئے کسی کو مخاطب بنا کر اُنہیں مکالمہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کی سب سے پہلی ذیلی نظم «شاعر»

میں وہ حضرت خضر علیہ السلام کو مخاطب بناتے ہیں جس میں مخاطب سے خود اقبال مراد ہیں. اقبال کو چونکہ حضرت خضر علیہ السلام سے مخاطب ہونا تھا اس لئے اس قبل نظم کے پہلے بند میں انہوں نے ساحلِ دریا کا ذہنی پس منظر رکھا ہے جس پسِ منظر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات حضرت خضر علیہ السلام سے ہوئی تھی اور جس کا ذکر سورۃ الکہف ۱۸ کی آیات ٦۰ تا ٦۵ میں وارد ہے۔

اس کے پہلے بند میں کلیدی مصرعہ یہ ہے۔ «چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب»۔ اقبال نے اپنے سارے کلام میں «چشم دل»، چشمِ بینا»، «دل بینا» اور «چشمِ جہاں بیں» جیسی تراکیب استعمال کی ہیں چونکہ دل منبع عشق ہے اور کائنات کے اسرار و رموز اور حقیقت کی آگاہی ظاہر کی آنکھ سے نہیں بلکہ چشم دل یا چشم بینا سے ہی ہو سکتی ہے۔ اس کا جواز اقبال نے سورۃ الحج ۲۲ کی درج ذیل آیت ۴٦ سے فراہم کیا ہے۔ فرمایا گیا:

«حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔»

اس ذیلی نظم کے دوسرے بند میں اقبال براہِ راست حضرت خضر علیہ السلام سے مخاطب ہیں اور حضرت خضر علیہ السلام کو اللہ کی مصلحتوں کے تحت خاص علم عطا کئے جانے کے سلسلہ میں اسی بند کے درجِ ذیل دوسرے ہی شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبال نے اُن تین واقعات کو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دورانِ سفر میں پیش آئے ایک مصرعہ میں واوین دے کر سمو دیا ہے جس کا تفصیلی ذکر سورۃ الکہف ۱۸ کے رکوع ۹ اور ۱۰ میں وارد ہے ؎

(کشتیِ مسکیں) و (جانِ پاک) و (دیوارِ یتیم)
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

دوسرے مصرعہ میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ جب حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی میں شگاف ڈال دیا، ایک لڑکے کو قتل کر دیا اور ایک یتیم کی دیوار گرادی تو تینوں مواقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تعجب کا اظہار

کیا جن کا ذکر سورۃ الکہف میں علی الترتیب آیات ۷۱، ۷۴ اور ۷۷ میں وارد ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس تعجب پر حضرت خضر علیہ السلام نے آیت ۸۲ میں جواب دیا کہ:

«یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے، میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کیا ہے۔»

اس شعر کے دوسرے مصرعہ کو ان ہی آیات کے حوالوں سے گرفت میں لایا جاسکتا ہے اور ساتھ ساتھ اس روایت کو بھی پیش نظر رکھا جائے جو تجرید بخاری شریف (اُردو) کے نمبر شمار ۱۰۲ میں منقول ہے کہ ان واقعات پر رسول اللہ نے فرمایا:

«موسیٰ علیہ السلام ایک دن وعظ فرمانے کے واسطے کھڑے ہوئے۔ (اثناء وعظ میں) کسی شخص نے عرض کیا۔ «یا نبی اللہ، دنیا میں سب سے زیادہ عالم کون ہے؟» اُنھوں نے جواب دیا۔ «سب سے زیادہ عالم میں ہوں۔» اُن کے اس پر اللہ کا عتاب نازل ہوا کیونکہ اُنھوں نے اللہ تعالی کا حوالہ نہ دیا (کہ اس کو خدا ہی جانتا ہے کہ دنیا میں سب سے بڑا عالم کون ہے)۔ چنانچہ اللہ تعالی نے اُن کی طرف وحی نازل فرمائی کہ موسیٰ، تم سے زیادہ جاننے والا ہمارا ایک بندہ ہے جو مجمع البحرین میں رہتا ہے۔ (اُس سے جاکر ملو)»۔

اس کے بعد کے شعر میں اقبال نے پہلا سوال حضرت خضر علیہ السلام سے اُن کی صحرا نوردی پر کیا اور اس کی وجہ دریافت فرمائی ـــــہ

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش

اس کے بعد ہی اقبال نے مزید تین سوالات پوچھے ـــــہ

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش

اور آخر میں پانچواں سوال پوچھنے کے قبل اقبال نے پہلی جنگ عظیم کے دوران شریف حسین آف مکہ کی نسلی سیادوں پر سلطنتِ عثمانیہ سے غداری کرنے پر یہ شعر لکھا ہے ؎

بیچتا ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ
خاک وخوں میں مل رہا ہے تُرکمانِ سخت کوش

اس شعر میں ہاشمی سے مراد شریف حسین آف مکہ ہیں جنہوں نے مکہ میں انگریزوں سے ساز باز کر کے ایک باغی حکومت قائم کرلی تھی۔ یہ وہی ہاشمی ہیں جنہیں انگریزوں نے اس غداری کے صلہ میں جنگ ختم ہونے پر اُن کے بیٹے فیصل اول کو عراق کا بادشاہ بنا دیا جب «جمعیتِ اقوام» نے عراق کو انگریزوں کی تولیت میں دے دیا حالانکہ فیصل اول کو عراق سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انگریزوں نے شریف حسین کے دوسرے بیٹے عبداللہ کو اُردن کا بادشاہ بنا دیا اور یہ بھی انگریزوں کی تولیت میں آگیا حالانکہ عبداللہ کو بھی اُردن سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اُردن کے موجودہ بادشاہ شاہ حسین اسی عبداللہ کے پوتے اور غدار شریف حسین کے پڑ پوتے ہیں۔ فیصل اول کی اس غداری پر اقبال نے «بانگ درا» کی غزلیات حصہ سوم کی آخری غزل میں اِس طرح تف کیا ہے ؎

تو بام و نسب کا حجازی ہے، پر دل کا حجازی بن نہ سکا

اب اس ذیلی نظم کے درج ذیل آخری شعر میں اقبال نے پانچواں سوال پوچھا ہے ؎

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے؟

اقبال نے یہ نظم «خضرِ راہ» ١٩٢٢ ع میں انجمنِ حمایتِ اسلام، لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھ کر سنائی تھی اور سننے والوں کا بیان ہے کہ جب اقبال اس نظم کو پڑھ رہے تھے تو وفورِ جذبات سے اُن کی طبیعت بالکل بے قابو تھی۔ وہ اکثر پڑھتے پڑھتے رک جاتے اور گلوگیر ہوجاتے تھے۔ آنکھوں سے آنسوؤں

کی جھڑی لگ جاتی تھی۔ جب اُنہوں اس بند کا متذکرہ بالا آخری شعر پڑھا تو بیس ہزار کا مجمع بے اختیار رو رہا تھا اور اقبال کا تو یہ حال تھا کہ روتے روتے گھگھی بندھ گئی۔

اس شعر میں «آگ» سے مراد ساری دنیائے اسلام پر عموماً اور دنیائے عرب پر خصوصاً مغربی سامراجیوں کا مسلط ہوجانا ہے۔ اور «اولادِ ابراہیم» سے مسلمان مراد ہیں «نمرود» سے مغربی سامراجی۔ اقبال نے اس شعر میں سورۃ الانبیاء ۲۱ کے رکوع ۵، سورۃ العنکبوت ۲۹ کے رکوع ۳ میں اور سورۃ الصٰفٰت ۳۷ کے رکوع ۳ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود (جس کا نام قرآن میں نہیں آتا) کے ہاتھوں صرف حق پرستی کی خاطر آگ میں ڈالے جانے کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ حق پرستوں کو کفار و مشرکین کے ہاتھوں ایسی ہی اذیتیں ہر زمانہ میں اٹھانی پڑی ہیں، اس لئے اس کڑے امتحان میں پھر «ایمانِ خلیل» کی ضرورت ہے جس کا اعادہ اقبال نے «بانگِ درا» کی نظم «جواب شکوہ» کے چھبیسویں بند کے اس شعر میں بھی کیا ہے ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اقبال نے «جوابِ خضر» کے تحت انہی پانچ سوالوں کا جواب الگ الگ ذیلی نظموں «صحرا نوردی»، «سلطنت»، «سرمایہ و محنت» اور «دنیائے اسلام» میں دیا ہے جن پر علی الترتیب آگے روشنی ڈالی جارہی ہے۔

صحـــــرا نوردی

اقبال حرکت و عمل کے شاعر تھے۔ مسلمانوں کی بے عملی نے اُنہیں حد درجہ بیزار کررکھا تھا۔ اُن کا تجربہ تھا کہ جب تک مسلمان صحرا نورد رہے اُنہوں نے ملیشیا، انڈونیشیا سے اسپین تک صرف عظیم سلطنتیں ہی قائم نہیں کیں بلکہ تسخیرِ کائنات کے قرآنی فرائض بھی انجام دیئے اور رشد و ہدایت اور علم کا دریا

بھی بنایا مگر جب وہ گوشہ نشیں ہوگئے اور تسخیرِ کائنات کے فریضہ سے غافل ہوگئے تو اُن پر کاہلی، بزدلی اور سستی غالب آگئی جو ان کی زبوں حالی کا باعث ہی حضرت خضر علیہ السلام سے صحرا نوردی پر پوچھے گئے سوال کا جواب اقبال نے یہ دلوایا ہے کہ ع

یہ تگا پوئے دما دم زندگی کی ہے دلیل

اور پھر اسی ذیلی نظم کے آخر شعر میں اس کی وجہ یہ بھی بتائی کہ ؎

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بیخبر رازِ دوامِ زندگی

اقبال کے کلام میں صحرا نوردی ایک خاص موضوع ہے اسی لئے «صحرا نشیں»، «لالۂ صحرا»، «کوہ و بیاباں»، «دشت پیمائی» اور «صحرا نوردی» کے الفاظ اُن کے کلام میں بار بار آتے ہیں اور اس ذیلی نظم میں صحرا نوردی کی مناسبت سے «ریت کے ٹیلے»، «فضائے دشت»، «بانگِ رحیل»، «خضر بے برگ و ساماں» اور «سفر بے سنگ و میل» جیسی تراکیب لا کر اقبال اسی «گردشِ پیہم» کا سماں باندھتے ہیں اور یہ باور کراتے ہیں کہ ؎

تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیریٔ کشت و نخیل

ان سارے اشعار سے اقبال یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ ایک زندہ اور مردہ قوم میں فرق یہ ہے کہ جو قوم گردشِ پیہم میں لگی رہتی ہے اور «زنجیریٔ کشت و نخیل» نہیں ہوتی اور عشرتِ امروز ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتی اُس قوم کا ستارہ ہمیشہ روشن رہتا ہے۔ اقبال اگر صرف «گردش پیہم» کو «رازِ دوامِ زندگی» قرار دیتے ہیں تو بلا واسطہ وہ سورۃ الملک ٦٧ کی درج ذیل آیت ۱۵ کی طرف دھیان مبذول کراتے ہیں۔ فرمایا گیا:

«وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو تابع کر رکھا ہے، چلو اُس کی

چٹائی پر اور کھاؤ خدا کا رزق، اُسی کے حضور میں تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔ "

اس آیت میں "چلو اس کی چٹائی پر اور کھاؤ خدا کا رزق" سے مراد دو وقت کا کھانا نہیں بلکہ تسخیرِ کائنات ہے جو صرف زمین کی چٹائی پر چلنے اور گردشِ پیہم ہی سے ممکن ہے۔ صحرا نوردی کے مضمرات اور "صحرا نشینوں" کے خصائص پر "بانگِ درا" کی نظم "خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں اقبال کا یہ شعر ہے ؎

عرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہانبان و جہاں آرا

اور پھر ان "صحرا نشینوں" سے اقبال اسی مجموعہ کی غزلیات حصہ دوم کی غزل "مارچ ۱۹۰۷ء" میں پر اُمید ہیں کہ ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

چونکہ حقیقت میں گردشِ پیہم ایک لازمی عنصر ہے اس لئے اقبال نے اس ذیلی نظم "صحرا نوردی" کے درج ذیل شعر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایمان لانے کے واقعہ کو نظم کیا ہے جس میں صرف "غروبِ آفتاب" کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے "چشمِ جہاں بیں" کے "روشن تر" ہونے کی بات لائی گئی ہے ؎

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل

اس شعر میں اقبال نے سورۃ الانعام ٦ کی آیات ۷۳ تا ۸۳ کی منظوم ترجمانی کی ہے، جن کا مطالعہ اس شعر کو گرفت میں لانے کے لئے ضروری ہے دوسرے یہ اس یاد دہانی کے لئے ضروری ہے کہ یہ غروبِ آفتاب ہی ہے جس کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے اسی سورۃ کی

آیت ۷۹ میں وہ کلمے نکلے جسے ساری دنیائے اسلام ہر نماز میں نماز کی نیت باندھنے کے قبل سیکڑوں سال سے پڑھتی آرہی ہے

اس ذیلی نظم میں اس کے بعد درجِ ذیل شعر میں صحرا نورد زندگی کا ایک سماں پیش کیا گیا ہے جہاں صحرا میں پانی کا چشمہ دیکھ کر کارواں اس کے گرد اُسی طرح جوق در جوق جمع ہوتا ہے جس طرح اہلِ ایماں، روزِ حشر، جنت میں گرد سلسبیل ہوں گے ؎

اور وہ پانی کے چشمے پر مقام کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گرد سلسبیل

اس شعر میں "اہلِ ایماں" کا لفظ بہت اہم ہے کیونکہ اس طرح اقبال نے صحرا نوردی کو بھی ایماں کا جزو قرار دیا ہے۔ اس شعر میں اقبال نے سورۃ الدھر ۷۶ کی درجِ ذیل آیت ۱۸ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"اُن (جنتیوں) کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی، یہ جنت کا ایک چشمہ ہوگا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے۔"

زنــــدگی

اس ذیلی نظم میں اقبال نے حضرت خضر علیہ السلام کی زبان پر دوسرے سوال: "زندگی کا راز کیا ہے؟" کا جواب رکھا ہے جس میں اُنھوں نے جوہرِ زندگی پیدا کرنے اور صفتِ دوام حاصل کرنے کی ترکیب بتائی ہے

پہلے بند کے پہلے شعر میں اقبال یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ انسان کو یہ وسوسہ لاحق نہیں ہونا چاہئے کہ موت ہر وقت انسان کو فنا کرتی رہتی ہے، اس لئے زندگی کو صفتِ دوام کیونکر حاصل ہوسکتا ہے۔ وہ یہ باور کراتے ہیں زندگی مرنے اور جینے کے تصور سے بالا تر حقیقت ہے۔ اس لئے دوسرے شعر میں وہ یہ نکتہ پیش کرتے ہیں کہ زندگی کو دنوں اور مہینوں یا برسوں کے پیمانہ سے

ناپنا نہیں چاہئے اور چونکہ " جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی" اس لئے زمانہ اس کو فنا نہیں کر سکتا۔

تیسرے شعر میں وہ صفت دوام پیدا کرنے کے لئے یہ کلیہ پیش کرتے ہیں ۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

یعنی زندگی کی اصل حقیقت ایک جوش اور ولولہ ہے جس کی بدولت وہ ظہور کے لئے بیتاب رہتی ہے۔ زندہ وہ ہے جو خدا کی طرح " کن " کہہ کر نئی دنیا پیدا کرے اقبال نے اس شعر میں لفظ " کن "، جس کے معنی ہیں " ہوجا"، لا کر قرآنی لفظ کی تلمیح کی ہے یہ لفظ قرآن میں "فیکون" کے ساتھ آیا ہے جس کے معنی ہیں۔ " اور وہ ہوجاتا ہے "۔ یہ دونوں الفاظ اُردو زبان میں تخلیق یا پیدائش کے معنی میں آتے ہیں اور قرآن کی بہت سی سورتوں میں وارد ہوئے ہیں جیسے سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۱۱۷، سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۸۳، سورۃ النحل ۱۶ کی آیت ۴۰، سورۃ یسٓ ۳۶ کی آیت ۸۲ اور سورۃ المؤمن ۴۰ کی آیت ۶۸ میں۔

چوتھے شعر میں اقبال نے زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے کوہکن یعنی فرہاد کی زندگی کا مطالعہ کرنے کی صلاح دی ہے یعنی جس نے شیریں کو پانے کے لئے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ اس شعر کے دوسرے مصرعہ۔ " جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی " میں اقبال نے سورۃ البلد ۹۰ کی درج ذیل آیت ۴ کی ترجمانی کی ہے :

" درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ "

اس کے بعد کے دوسرے شعر میں اقبال نے غلامی اور آزادی کا فرق بتایا ہے اور اس کے شعر میں زندگی کو خودی سے تعبیر کرتے ہوئے خودی کو مستحکم کرنے کی تلقین کی ہے جو بظاہر تو جسم میں پوشیدہ ہے لیکن وہ کائنات کو مسخر کرنے کی طاقت رکھتی ہے اور اسی عملِ تسخیر سے وہ اپنے آپ کو عیاں رکھتی ہے۔

ساتویں شعر میں اقبال نے یہ باور کرایا ہے کہ یہ دنیا امتحان گاہ ہے اور تجھ کو خــــدا نے اسی لئے پیدا کیا ہے کہ تو شریعتِ اسلامیہ کا اتباعِ کاملہ کی بدولت اپنی عقلی قوتوں کو بروئے کار لائے اور کائنات کو مسخر کرکے امتحان میں کامیابی حاصل کرے کیونکہ یہ دنیا دارالعمل ہے اور عمل کا وقت موت کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے اس لئے جو شخص اپنی خودی کی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتا، وہ یقیناً فنا ہوجائے گا۔ اقبال نے اس شعر میں درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :

«اور وہی جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، جب کہ اس سے پہلے اُس کا عرش پانی پر تھا۔ تاکہ تم کو آزما کر دیکھے تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔» (سورۃ هود ۱۱ ، آیت ۷)

« کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ «ہم ایمان لائے» اوراُن کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم اُن سب لوگوں کی آزمائش کرچکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟ (سورۃ العنکبوت ۲۹ ، آیات ۲ اور ۳)

« نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں (کائنات کی) سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کردیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے ، اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔» (سورۃ الملک ۶۷ ، آیات ۱ اور ۲)

« ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اُس کا امتحان لیں اور اسی غرض کے لئے اُسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔»

(سورۃ الدھر ۷٦ ، آیات ۱ اور ۲)

اس پہلے بند کے آخری شعر میں اقبال نے خودی کی تربیت کی ترغیب دی ہے کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو انسان اور تودۂ خاک میں کوئی فرق نہ رہے۔ وہ یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ اگر تو عشقِ رسول کی بدولت اپنی خودی کو مستحکم کرائے

تو پھر تو تلوار بن جائے گا، یعنی باطل پر غالب آکر صفت دوام حاصل کرے گا۔

اس ذیلی نظم کے دوسرے بند کے پہلے شعر میں اقبال نے جوہر زندگی کے حصول کے آرزومند لوگوں کو، جو بقا کے طالب ہیں، پہلے اپنے اندر جان پیدا کرنے یعنی عشقِ رسول اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ اسی کی بدولت اُسے حقیقی زندگی حاصل ہوگی۔ تیسرے شعر میں کہتے ہیں کہ جب تو اس طرح دوبارہ زندہ ہوجائے گا تو تجھ میں اتنی طاقت پیدا ہوجائے گی کہ قوتِ پنہاں کو آشکارا کردے۔ یعنی تیری خودی کی تمام مخفی استعدادیں بروئے کار آجائیں گی اور تیری خودی (چنگاری) صفتِ دوام حاصل کرے گی۔ چوتھے شعر میں یہ باور کراتے ہیں کہ جب تو ایسا کرے گا تو پھر تو اور تیری قوم ایشیا (خاکِ مشرق) کو فتح کرے گی۔ اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبال نے «بدخشاں» کو بطور جغرافیائی اصطلاح استعمال کیا ہے بدخشاں عہد وسطیٰ میں ایک ملک کا نام تھا جو ہندوستان اور خراساں کے درمیان واقع تھا۔ یہ لعل اور سونے کی کانوں کے لئے مشہور ہے۔ پانچویں شعر میں اقبال یہ نصیحت کرتے ہیں کہ تو راتوں میں اُٹھ کر اللہ کے حضور میں خشوع اور خضوع کے ساتھ دعائیں کر تاکہ وہ تجھ پر مہرباں ہو۔ «نالۂ شب گیر» کے بغیر روحانیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس بند کے آخری شعر میں اقبال یہ باور کراتے ہیں کہ تو یہ مت سمجھ کہ حشر مرنے کے بعد ہوگا۔ بلکہ یہ حشر تو برپا ہوچکا ہے اس لئے تو اپنی زندگی پر غور کر کہ تو نے کونسی عمل کیا ہے یا نہیں۔ یعنی غفلت سے بیدار ہوکر جدو جہد میں مصروف ہوجا۔

سلطنت

اس ذیلی نظم میں اقبال نے حضرت خضر علیہ السلام کی زبان پر تیسرے سوال «سلطنت کیا چیز ہے؟» کا جواب رکھا ہے۔ اس کا پسِ منظر یہ ہے کہ جب مہاتما گاندھی نے ۱۹۱۷ء میں، جنوبی افریقہ سے واپس آکر، چمپارن سیتا گڑھ سے ہندوستان کی آزادی کی جنگ شروع کی تو قصر برطانیہ میں زلزلہ آگیا اور اس

بیداری کو دبانے کی خاطر حکومت برطانیہ نے پارلیامنٹ سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ع میں منظور کرایا جس کا نفاذ اپریل ۱۹۲۱ع سے ہوا اس کے ذریعہ ہندوستان میں پہلے پہل ہر برطانوی ہند کے صوبوں میں، جن کی تعداد نو تھی، لیجسلیٹو کاسل قائم کی گئی جس میں ہندوستانیوں کو نمائندگی دی گئی اور ایسے ہر صوبہ میں ایک ہندوستانی وزیر اعظم کی تقرری کی گئی جہانتک اختیارات کا سوال ہے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا جسے «ڈیارکی» کہتے ہیں اور سارے اہم محکمے جیسے خزانہ، امور داخلہ وغیرہ گورنر کے پاس رہے اور غیر اہم محکمے جیسے زراعت، تعلیم وغیرہ اس وزارت کو سونپے گئے۔ اقبال اس نام نہاد اصلاح سے خوش نہ تھے کیونکہ برطانیہ نے چند نام نہاد رعایات و حقوق دے کر ہندوستانیوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی اسی پس منظر میں اقبال نے مغربی سامراجیوں کے طریقۂ حکمرانی کو اس ذیلی نظم میں اپنا نشانہ بنایا اور اصولی طور پر اس طریقۂ کار کی مذمت کی۔

اس ذیلی نظم کا کلیدی شعر اس کا درج ذیل پہلا شعر ہے ؎

آشناؤں تجھ کو رمز إنّ الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

اس شعر میں اقبال نے «إنّ الملوک» کی اصطلاح لاکر سامراجیوں کے طریقۂ حکمرانی کی نشاندہی کی ہے یہ اصطلاح سورۃ النمل ۲۷ کی درج ذیل آیت ۳۴ میں وارد ہوئی ہے

«(جب ملکۂ سبا کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ملا کہ «میرے مقابلہ میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہوجاؤ تو) ملکہ نے (سرداران قوم کو بلا کر) کہا کہ: «بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کردیتے ہیں، یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں۔»

اس شعر کے بعد اس ذیلی نظم میں اقبال نے اقوام غالب کی حکمرانی کے اسی رمز إنّ الملوک کی تفصیل بتائی ہے۔ چنانچہ دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ

اگر محکوم قوم آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے تو حکمراں قوم اس بیداری کو اپنی ساحری سے پھر سلا دیتی ہے اور وہ اپنے مقصد سے غافل ہوجاتے ہیں۔ تیسرے شعر میں محمود و ایاز کی تلمیح لا کر اقبال محکوم قوم کو ایاز اور حکمراں قوم کی ساحری کو «جادوئے محمود» سے تعبیر کرکے یہ نکتہ پیش کرتے ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ غلام قوم کی نظر میں غلامی کا طوق، جو اُس کی گردن میں پڑا ہے، عزت کا نشان (سارِ دلبری) دکھائی دینے لگتا ہے «جادوئے محمود» سے مراد یہ ہے کہ سلطان محمود غزنوی اپنے غلام ایاز کے خم شدہ بالوں پر عاشق تھا اسی لئے اُردو ادبیات میں لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی طرح عشق و محبت کے معاملے میں محمود و ایاز بھی ایک اصطلاح بن گئی ہے۔

چوتھے شعر میں اقبال یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ اپنی قوم کو آزاد کرانے کے لئے وہی کوشش کرتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو آزاد کرانے کے لئے کی تھی۔ یعنی اُس طلسم کو توڑ دیتا ہے جو ملوکیت نے باندھا تھا۔ اس شعر میں اقبال نے اسرائیل، موسیٰ اور سامری کو بطور اصطلاح استعمال کیا ہے جو دراصل قرآنی اصطلاحیں ہیں۔ اسرائیل کی اصطلاح اقبال نے سورۂ آل عمران ۳ کی آیت ۹۳ سے لی ہے جس میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام اسرائیل وارد ہوا ہے اور اس لقب کی وجہ سے آپ سے جو نسل نکلی وہ بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس شعر میں اسرائیل سے مراد مسلمان ہیں اس لئے کہ بنی اسرائیل مسلمان تھے جنہیں مصر کے بادشاہ فرعون نے غلام بنا رکھا تھا، جنھیں غلامی سے نجات دلانے کے لئے خدائے تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا تھا کہ سورۂ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۲۴ میں وارد ہے۔ اس شعر میں «طلسم سامری» سے مراد فرعون کے جادوگروں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان گزرے ہوئے وہ سارے واقعات ہیں جن کا تفصیلی ذکر سورۃ الاعراف ۷ کے رکوع ۱۴ میں وارد ہے۔ اور جس میں فرعون اور اُس کے جادوگروں کے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مغلوب ہونے اور اُن کے فتح مند ہونے کی بات کہی گئی ہے۔ اور پھر اسی سورۃ کی آیت ۱۳۷ میں فرعون اور اُس کی قوم کو برباد کرنے کی

باعث ہوتی آتی ہے۔ جہاں تک «سامری» کی اصطلاح کا سوال ہے اس کا ذکر سورۂ طٰہٰ ٢٠ کے رکوع ۴ اور ۵ میں وارد ہے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا جس کا اصلی نام روایات میں موسیٰ ابن ظفر بتایا جاتا ہے۔ جب حضرت موسیٰ کو خدائے تعالیٰ نے چالیس شب و روز کے لئے کوہِ سینا پر طلب فرمایا (سورۃ الاعراف ٧، رکوع ١٧) تو اُن کی غیر حاضری میں سامری نے لوگوں سے سونا مانگ کر ایک بچھڑا بنایا جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی (سورۃ الاعراف ٧، آیت ١۴٨)۔ گوسالہ پرستی کی ابتدا اسی واقعہ سے ہوتی ہے اور ایسی ہی ساحری کو اُردو ادبیات میں «طلسمِ سامری» کہا جاتا ہے۔

پانچویں شعر میں اقبال یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ بادشاہت صرف اللہ کے لئے زیبا ہے۔ اس شعر کے پہلے مصرعہ کو گرفت میں لانے کے لئے طٰہٰ ٢٠ کی آیت ١١۴ کا پہلا فقرہ، سورۃ المؤمنون ٢٣ کی آیت ١١٦، سورۃ النور ٢۴ کی آیت ۴٢ اور سورۃ الفرقان ٢۵ کی آیت ٢ کا پہلا فقرہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ اقبال نے بلا واسطہ انہی آیات کی ہو بہو ترجمانی اس مصرعہ میں کی ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبال نے «آزری» کو بطور اصطلاح استعمال کیا ہے جس سے یہاں پر یہ نکتہ نکالتے ہیں کہ دنیا کے جتنے بادشاہ جو دوسروں کو غلام بناتے ہیں وہ سب بت ہیں اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان بتوں کو اُسی طرح توڑ دیں جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف خدا کے بادشاہِ حقیقی ہونے کی وجہ سے اپنے باپ آزر کے سارے بتوں کو توڑ ڈالا تھا جس کے توڑنے کا ذکر سورۃ الصّٰفّٰت ٣٧ کی آیت ٩٣ میں وارد ہے۔

چھٹے شعر میں «فطرتِ آزاد» سے مراد خودی ہے جسے اللہ نے آزاد پیدا کیا ہے۔ اس لئے اقبال یہ باور کراتے ہیں کہ اگر مسلمان ہونے کے باوجود تو کسی انسان کے سامنے جھکتا ہے تو بلاشبہ تو برہمن سے بڑھ کر کافر ہے۔ اسی نکتہ پر «بالِ جبریل» کی غزل ٧ میں اقبال کا یہ شعر بھی پیشِ نظر رکھیں ؎

پانی پانی کر گئی مجھکو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا، نہ تن

ساتویں شعر میں حضرت خضر علیہ السلام مغربی جمہوریت کی حقیقت بیان کرتے ہیں کہ یورپ میں جس قسم کی جمہوریت رائج ہے وہ دراصل ملوکیت (قیصریت) ہی کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے۔ اس شعر میں اقبال نے "قیصری" کی اصطلاح روس بادشاہوں کے لقب "سیزر" سے اخذ کی ہے جسے عجمی زبان میں قیصر کہتے ہیں۔

آٹھویں شعر میں اقبال نے ظلم و ستم اور مطلق العنانی کے لئے "دیو استبداد" اور سامراجیوں کے ذریعہ دی گئی نام نہاد رعایات و حقوق کو "آزادی کی نیلم پری" سے موسوم کیا ہے

نویں شعر میں اقبال گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۱۹ ع کے ذریعہ ہندوستانیوں کو دی گئی نام نہاد مجلسِ آئین (یعنی لیجسلیٹیو کاسل کا قیام) و اصلاح و رعایات و حقوق کی مذمت کرتے ہیں جنہیں وہ افیون کی گولیوں سے تعبیر کرتے ہیں جو طبِ مغرب کی رو سے غلاموں کو کھانے میں تو میٹھی لگتی ہیں مگر کھانے والوں کو یہ گہری نیند سلا دیتی ہیں تاکہ یہ آزادی کے لئے جد و جہد نہ کرسکیں۔ اقبال اس ایکٹ کے تحت پنجاب لیجسلیٹیو کاسل کے لئے لاہور کے مسلم حلقہ سے ۱۳ نومبر ۱۹۲۶ ع کو ایم۔ ایل۔ سی۔ منتخب ہوئے تھے اس لئے اس کی کارگزاریوں پر اُنہوں نے "بانگِ درا" کے باب "ظریفانہ" میں "نیلم پری" کے نام سے اس طرح مذاق اُڑایا ہے

ہندوستاں میں جزوِ حکومت ہیں کونسلیں آغاز ہے ہمارے سیاسی کمال کا
ہم تو فقیر تھے ہی، ہمارا تو کام تھا سیکھیں سلیقہ اب اُمرا بھی "سوال" کا

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری، کونسل، صدارت بنائے خوب آزادی نے پھندے

میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

دسویں شعر میں بھی کچھ ایسی ہی باتیں کہی گئی ہیں اور ذیلی نظم کے

گیارہویں اور آخری شعر میں اقبال مسلمانوں پر تف کرتے ہیں کہ تو اس سراب کو گلستاں اور اس قفس کو آشیاں (آزادی) سمجھ بیٹھا ہے۔

سرمایہ و محنت

اس ذیلی نظم میں اقبال نے حضرت خضر علیہ السلام کی زبان پر چوتھے سوال: «اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟» کا جواب رکھا ہے۔ اس میں اقبال نے مزدوروں (یعنی محنت کشوں) کو ۱۹۱۷ع کے روسی اشتراکی انقلاب کے پس منظر میں ایک خوش آئند مستقبل کا پیغام دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ سرمایہ داروں کے ہاتھوں مزدور طبقہ کے استحصال پر مختلف طریقوں سے روشنی ڈالی ہے

اس ذیلی نظم کا کلیدی شعر اس کا چوتھا شعر ہے جس میں «ساحر الموط» کا حوالہ دے کر اقبال نے مزدوروں کو یہ باور کرایا ہے کہ یہ سرمایہ دار تجھے رہبر کا پیالہ دیتے ہیں اور تو اسے آب حیات سمجھتا ہے۔ اقبال کی تبحر علمی اور وسیع مطالعہ کی داد دینی پڑے گی کہ وہ اس ذیلی نظم میں مخاطب مزدوروں سے ہیں اور باتیں سرمایہ و محنت کی کررہے ہیں مگر سرمایہ داروں کے لئے «ساحر الموط» کی ایک ایسی اصطلاح لاتے ہیں جو عالمی اور اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ لفظ «ساحر» کی مناسبت سے «برگِ حشیش» (بھنگ کا پتہ) اور «شاخ نبات» (مصری کی ڈلی) کی موزونیت پر قربان جائیے۔ سرمایہ داروں کے ہاتھوں مزدوروں کے استحصال پر اس سے بہتر اصطلاح شاید مارکس اور لینن کے ذہن میں بھی نہ آئی ہوگی۔ یہ اصطلاح قدرے تشریح طلب ہے تاکہ اس شعر کو گرفت میں لایا جاسکے۔

خلفائے بنی عباس کے دور خلافت (۷۵۰ع تا ۱۲۵۸ع) میں ایک شخص حسن بن صباح گذرا ہے جو نہایت ہوشمند، عالی دماغ اور عالم و فاضل تھا۔ جس کی وجہ سے مقتدی کے دور میں باطنی تحریک نے بہت بڑی قوت حاصل کرلی۔ یہی باطنی فرقہ اسمٰعیلی قرار پایا۔ حسن بن صباح اس تحریک کا بہت بڑا داعی

تھا۔ حالانکہ اس تحریک کو شیعیت سے براہ راست تعلق نہ تھا مگر اس تحریک کے بانیوں نے اسے کامیاب بنانے کے لئے اسے امام جعفر صادق کے صاحبزادے حضرت امام اسمٰعیل سے منسوب کردیا۔

حسن بن صباح نے قزوین کے قریب الموط کے قلعہ پر، جو کوہ البرز کی چوٹی پر دس ہزار فٹ کی بلندی پر ہے، قبضہ جمانے کے بعد اُسے باطنی تحریک کا مرکز بنا لیا تھا اور ہزاروں مسلمانوں کو اپنے دام فریب میں مبتلا کرلیا تھا۔ اور اُس کے ساتھ فدا کاروں کی ایک بہت بڑی ایسی جماعت تھی جن کے ذریعہ یہ جس کو چاہتا قتل کروا دیتا تھا۔ یہ تحریک اُس زمانے کے بادشاہوں، اُمراء اور مقتدر حضرات کے لئے خطرہ بن گئی تھی۔ جب سلجوقی حکومت کے وزیر اعظم نظام الملک طوسی نے اس باطنی تحریک کو کچلنے کے لئے قدم اُٹھایا تو حسن بن صباح نے اُسے اپنے فدائی کے ذریعہ قتل کروا دیا۔ اقبال نے اس شعر میں اسی حسن بن صباح کے لئے "ساحرِ الموط" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

اب "ساحر الموط" کی اصطلاح کی تفصیل جان چکنے پر "برگ حشیش" اور "شاخ نبات" اور حسن بن صباح کی "ساحری" پر آئیے۔ حسن بن صباح نے قلعہ الموط میں ایک جنت بنائی تھی جس میں جارجیہ اور سرکاشیہ (کوہ قاف) کی حسین عورتیں جمع کی جاتی تھیں ان ہی عورتوں کو اہل علم "کوہ قاف" کی پری کہا کرتے ہیں۔ حسن بن صباح حسن پرست نوجوانوں کو "برگِ حشیش" (جس سے انگریزی کا لفظ Assisination بنا ہے) یعنی بھنگ پلا کر عالم بیہوشی میں اُس جنت میں بھیج دیا کرتا تھا جہاں یہ نوجوان چند روزہ زندگی کا لطف اُٹھاتے تھے۔ وہاں پر نوجوان کی محبوبہ اپنے دست نازک سے جام شراب پلاتی تھی جس میں بھنگ بھی شامل ہوتا تھا اور جب وہ بیہوش ہوجاتے تھے تو پھر اسی دنیا میں واپس آجاتے تھے۔ واپس آنے پر حسن بن صباح اُن سے کہتا کہ تم اگر اپنی محبوبہ کے پاس واپس جانا چاہتے ہو تو فلاں بادشاہ یا فلاں وزیر یا فلاں مسلم عالم دین کو قتل کردو چنانچہ یہ لوگ اپنے "مرشد" کے حکم کی تعمیل کرتے تھے اور فدائی کا لقب حاصل کرلینے کے بعد دوبارہ اپنی محبوبہ سے

شرف ملاقات حاصل کرتے تھے۔

اقبال ساری زندگی سرمایہ دارانہ نظام کی مذمت کرتے رہے۔ روسی اشتراکی انقلاب سے اُن کو یہ اُمید بندھی کہ اب شاید یہ نظام رو بہ زوال ہو۔ چنانچہ کئی سال بعد اُنہوں نے "بالِ جبریل" کی نظم "زمانہ" کے اس شعر میں جہانِ نو کے پیدا ہونے کی بشارت دی ؎

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے، بنا دیا ہے قمارخانہ

اور پھر اسی مجموعہ کی مثنوی "ساقی نامہ" کے دوسرے بند میں کہتے ہیں ؎

گیا دورِ سرمایہ داری گیا تماشہ دکھا کر مداری گیا

اور پھر "ضربِ کلیم" کی نظم "اشتراکیت" میں یہ باور کراتے ہیں ؎

انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

اُسی زمانہ میں جب ۱۹۱۷ ع میں روس میں اشتراکی انقلاب وقوع پذیر ہوا تو اقبال نے "بانگِ درا" کے "ظریفانہ" حصے میں درج ذیل نظم شامل کی ہے جس میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کی اس صف آرائی کو قیامت کے مناظر سے تعبیر کرتے ہوئے فرمایا ؎

محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے دیکھئے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خوں
حکمت و تدبیر سے یہ فتنۂ آشوب خیز ٹل نہیں سکتا "وقد کنتم بہٖ تستعجلون"
"کھل گئے" یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشم مسلم دیکھ لے تفسیر حرف "ینسلون"

"وقد کنتم بہٖ تستعجلون" کے معنی ہیں: "تم خود ہی اس (روزِ حشر) کے جلدی آنے کا تقاضا کررہے تھے" اور یہ آیت سورۃ یونس ۱۰ کے رکوع ۵ میں

وارد ہوئی ہے۔ یاجوج اور ماجوج کے «کھول دیئے جانے» کا ذکر بروز حشر سورۃ الکہف ۱۸ کی آیت ۹۴ اور سورۃ الانبیاء ۲۱ کی آیت ۹٦ میں وارد ہوا ہے اور «ینسلون» کا لفظ قیامت ہی کے سلسلہ میں سورۃ الانبیاء ۲۱ کے رکوع ۷ اور سورۃ یٰسٓ ۳٦ کی آیت ۵۱ میں استعمال ہوا ہے۔

اقبال سرمایہ دارانہ نظام سے اس قدر بیزار تھے کہ انہوں نے اپنے کلام میں ایک موقع پر «بال جبریل» کی نظم «لینن» کی زبان پر خدا سے مخاطب ہوکر یہ دعا رکھی ہے ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

یہ نہیں کہ اقبال اشتراکی نظام معیشت کے دلدادہ تھے۔ کیونکہ ایک مسلمان گمرہی میں بہت دور جاسکتا ہے مگر مارکسی کمیونسٹ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ مارکسزم کی بنیاد ہی انکار خدا پر ہے اور اس کے بانی کارل مارکس نے مذہب کو افیون قرار دیا ہے۔ اس لئے اگر اقبال «ضرب کلیم» کی نظم «اشتراکیت» میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اشتراکیوں کی اس صف آرائی سے خوش ہیں تو صرف اس لئے کہ جب یہ سحر ٹوٹے گا تو اسلامی نظام معیشت قائم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اسی نظم کے آخر میں مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ ؎

اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار | قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار | جو حرف «قل العفو» میں پوشیدہ ہے اب تک

اقبال نے سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۲۱۹ میں وارد «قل العفو» کی تلمیح دوسرے شعر میں کی ہے

یہ نہیں کہ اقبال صرف مغربی سامراجیوں کے سرمایہ دارانہ نظام سے نالاں تھے بلکہ مسلم ممالک اور مسلم معاشرہ میں بھی اس نظام کے رائج ہونے پر حد درجہ متفکر تھے اس لئے کہ یہ حرف «قل العفو» کی نفی کرتی ہے۔ چنانچہ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں «ارمغان حجاز» کی نظم «ابلیس کی مجلس شوریٰ»

میں ابلیس کی زبان پر درج ذیل شعر رکھا ہے جس میں ابلیس اپنے مشیروں کو مخاطب کر کے کہتا ہے ــــہ

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

پھر مسلمانوں کو ہی مخاطب کر کے «بانگ درا» کی نظم «طلوعِ اسلام» کے آٹھویں بند میں اُنہیں یاد کراتے ہیں کہ ــــہ

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

دنیائے اسلام

اس ذیلی نظم میں اقبال نے حضرت خضر علیہ السلام کی زبان پر اس پانچویں اور آخری سوال کا جواب رکھا ہے ــــہ

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

اس ذیلی نظم کا پس منظر، دوران پہلی جنگ عظیم، نسلی بنیادوں پر عربوں کی ترکوں سے غداری اور نتیجتاً سارے سلطنت ترکیہ کے صوبوں پر الگ الگ مغربی سامراجیوں کا قبضہ اور اُن پر اُن کے ذریعہ کٹھ پتلی حکومتوں کا قیام ہے جس پر روشنی ذیلی نظم «شاعر» میں ڈالی جاچکی ہے۔

اس ذیلی نظم کے پہلے بند کے دوسرے شعر میں اقبال نے مکہ میں غدار شریف حسین آف مکہ کی انگریزوں کی قائم کردہ کٹھ پتلی حکومت کا ذکر کیا ہے جہاں «میراث خلیل» یعنی کعبۂ محترم واقع ہے مگر آج اُن پر «تثلیث کے فرزند» یعنی عیسائیوں کی حکمرانی ہے۔ تیسرے شعر میں ترکوں کی بدحالی اور چوتھے میں ایران میں مغربی تہذیب اور معاشرت کو اپنائے جانے کا ذکر ہے۔ پانچویں

شعــــر میں ساری ملت اسلامیہ کے پارہ پارہ ہونے کی بات ہے اور چوتھے میں مسلمانوں کا خـــــون پانی کی طرح ارزاں ہونے اور مغربی سامراجیوں کے مقتل پر بہائے جانے کا ذکر ہے۔ اور آخری شعر میں اقبال اپنے مرشد رومی کی یہ صلاح یاد دلاتے ہیں کہ جب ہم کسی پرانی عمارت کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اُس کو مسمار کرتے ہیں اور پھر اسے از سر نو تعمیر کرتے ہیں ۔

جب مسلمانوں نے اپنے آپ کو مجبور و مقہور پا کر مغربی سامراجیوں سے رحم کی درخواست شروع کردی تو اقبال نے اس ذیلی نظم کے دوسرے بند کے دوسرے شعر میں مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ اپنے مصائب کا علاج غیروں سے طلب نہ کریں بلکہ اس « مومیائی کی گدائی » سے اچھا ہے کہ شکست تسلیم کرلیں اس شعر میں اقبال نے مسلمانوں کو « مور بے پر » یعنی بیکس چیونٹی سے تشبیہ دی ہے اور اپنی ضرورتیں « سلیمانے » یعنی کسی بادشاہ کے سامنے نہ رکھنے کا مشورہ دیا ہے اس شعر میں اقبال نے سورۃ النمل ۲۷ کی آیت ۱۸ کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا مطالعہ اس شعر کوگرفت میں لانے کے لئے ضروری ہے۔ اسی مضمون میں « بانگ درا » کی نظم « شکوہ » کے ستائیسویں بند کا یہ شعر بھی ہے جہاں یہی تلمیحات استعمال کی ہیں ـــــ :

مشکلیں اُمتِ مرحوم کی آساں کردے
مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کردے

پھر اگلے دو اشعار میں اقبـال نے مسلمانوں کو متحـد ہونے اور دین کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کی تلقین کی ہے اور بلاواسطہ سورۃ آل عمران ۳ کی آیت ۱۰۳ کی یاد دلائی ہے۔ اور چونکہ مسلمانوں نے خود نسلی بنیادوں پر مغربی سامراجیوں کے ورغلانے پر یہ مصیبت بلائی تھی اس لئے اس بنـــد کے ساتویں شعر میں اقبال نے اُنہیں سورۃ الانفال ۸ کی درج ذیل آیت ۴۶ کی یاد دلائی ہے :

« اللہ اور اُس کے رسول کی اطـاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہوجائے گی اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ صبر سے

کام لو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے »

اور اس بند کے آخر میں اقبال نے مسلمانوں کی سب سے زیادہ دکھتی رگ کو چھیڑا ہے کہ تم آخر کب تک اس مسئلہ پر آپس میں جھگڑتے رہوگے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت علی میں کون افضل ہے۔

اس ذیلی نظم کے آخری بند میں اقبال مسلمانوں کو مغرب کی مادیت اور مشرق کی روحانیت کی دانیں سامنے لاکر یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ مغرب کی لادینیت اُن کے حق میں وبال جان بن جائے گی اور دنیا اسلام کی صداقت کی شہادت دے گی جب ملوکیت اور سرمایہ داری کا خاتمہ ہوجائے گا تو نئی دنیا پیدا ہوگی گویا ان دونوں کے خاکستر سے نیا اسلامی نظام عالم وجود میں آئے گا۔ جس طرح اسلام پہلے دور میں پیام رحمت ثابت ہوچکا ہے اسی طرح آئندہ دور میں بھی رحمت ثابت ہوگا۔

آخر میں اقبال مسلمان کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ تو اپنے سینوں کو آرزوؤں سے آباد رکھ اور اس آیت « لا یخلف المیعاد » کو یاد رکھ کیونکہ خدا کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ یہ آیت قرآن میں سورۃ البقر ۲ کی آیت ۹، سورۃ آل عمران ۳ کی آیت ۹، سورۃ الرعد ۱۳ کی آیت ۳۱ اور سورۃ الزمر ۲۹ کی آیت ۲۰ میں وارد ہوئی ہے پھر الفاظ کے تھوڑے رد و بدل کے ساتھ اسی معنی میں سورۃ آل عمران ۳کی آیت ۹۴ اور سورۃ الروم ۳۰کی آیت ۶استعمال ہوئی ہے

• • •

شاکر اٹکی ۔ ایک گمنام صوفی شاعر

از

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ، گورنمنٹ کالج ، اٹک ، پاکستان

۱۲ ویں صدی ہجری میں خطۂ چھچھ کے صوفی شاعر «شاکر»[1] اُس وقت اُردو میں طبع آزمائی کر رہے تھے جب ولی کا نام اور کام شمالی ہند تک نہیں پہنچا تھا۔ پھر یہ بھی طے شدہ حقیقت ہے کہ محمد عبدالشکور شاکر تمام عمر اٹک اور نو شہرہ ہی میں رہے اور انہیں دلی ، دکن یا گجرات تک جانے کا موقع نہیں ملا کہ وہ اُس زمانے کے ہندوی ادب سے اثر قبول کرتے

«دیوان شاکر» — فارسی ، عربی اور اُردو (یا ہندوی) کی ملی جلی اصناف مثلاً دعا ، مناجات ، مثنوی ، غــزل ، قطعہ ، رباعی ، معما ، تاریخ ، مرثیہ ، نوحہ ، مسدس ، مخمس ، مستزاد ، قصیدہ ، دوہا ، دو بیتی اشعار اور مفرادت پر مشتمل ہے ۔ اس اعتبار سے محمد عبدالشکور شاکر ضلع اٹک کے اولین صاحب دیوان فارسی شاعر ہیں ۔ اُن کی اُردو شاعری کے متروکات کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ولی دکنی کے ہمعصر بھی ہیں اور غزل کے محسنین میں سے ایک محسن بھی ۔

«دیوان شاکر» میں شامل ایک فارسی مرثیـــہ (اکلوتے جوانمرگ بیٹے کی وفات پر) کے مطابق محمد عبدالشکور ۱۱۸٦ ھ/۱۷۷۲ ع تک بہر طور حیات تھے ـــ

بوداز ہجرت ہزار و یک صد و ہشتاد و شش
چار شنبہ وقت پیشیں قطع شد لخت جگر

ایک اندازے کے مطابق شاکر کا زمانہ ولادت شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات ۱۱۱۸ ھ مطابق ۱۷۰٦ ع کے فوراً بعد کا ہے «دیوان شاکر» میں شامل کسی شعر میں بھی شاعر کا پورا نام نہیں ملتا ، تخلص البتہ اُن کے فارسی ، عربی اور اُردو اشعار میں ہونا ثابت ہے ۔

اُن کے قلمی دیوان میں ایک منظوم شجرہ ملا ہے[2] جس میں شاعر اپنے سلسلۂ فیض کو حضرت یحییٰ الکی المعروف حضرت جی بابا (م ۔ ۱۱۳۲ ھ/۱۷۱٦ ع)

سے ملاتے ہیں یہاں تک کہ یہ سلسلہ دو واسطوں سے حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (م۔ ۱۰۳۵ھ) سے جاملتا ہے

دیوان میں شامل ایک عربـــی قصیدہ بعنوان « مناجات بہ جناب مرشد خود رحمۃ اللہ علیہ » شامل ہے اس قصیدے کا ایک شعر نقل کرتا ہوں ـــــ

عرقنی الاثم یا حـــدی ترحم
واکشف عن فوادی فی الکسوف

یہاں « یا جدی » سے مراد حضرت شیخ یحییٰ اٹکی ہی ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاعـــر حضرت یحییٰ اٹکی کے سلسلۂ نسب سے ہے ہماری خاندانی روایت کے مطابق شاعر محمد عبدالشکور شاکر۔ حضرت یحییٰ اٹکی کے خلیفہ تھے

حضرت یحییٰ اٹکی المعروف بہ جی بابا (آپ کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ۱۰۳۲ھ یا ۱۰۲۸ھ) کا مزار اٹک خرد میں دریائے سندھ کے کنارے برلب جرنیلی سڑک، خلائق عامہ کے روحانی سکون کا باعث ہے۔ آپ شمالی پوٹھوہار یعنی علاقہ چھچھ میں اپنے وقت کے «قطب» ہوتے ہیں۔ مجھ بےچمداں کی نسبت بھی اُسی مرد قلندر سے ہے، حضرت جی بابا رشتہ میں میرے بڑے بابا تھے، جب اپنے شجرۂ نسب کو دیکھتا ہوں تو پتا چلتا ہے کہ حضرت شیخ یحییٰ اٹکی کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا (شیخ محمد اسماعیل) تھا۔ شیخ محمد اسماعیل لاولد تھے[۳]۔ حضرت شیخ یحییٰ اٹکی کے نواسوں میں صرف دو نام ملتے ہیں (۱) شیخ محمد عبـــدالشکور اور (۲) شیخ محمد عبداللہ۔ یہ دونوں بھائی حضرت یحییٰ اٹکی کی بڑی صاحبزادی کے بطن سے ہیں، جو موضع صاحبق (میاں گوجـــر) کے شیخ، رحیم داد بن شیخ نوبہار غـاری سے بیاہی گئی تھیں۔ شیخ رحیم داد داؤد زئی پٹھان تھے۔ ملا منصور کے موجودہ صاحبزادگان اسی خـاندان سے ہیں۔ حضرت کی چھوٹی بیٹی موضع پڑانگ (چار سدہ) کے شیخ میاں رامباز ابن شیخ میاں محمد یار سے بیاہی گئی تھیں، جن کی اولاد حضرت یحییٰ اٹکی کے

مزار کے اوقاف کے زیر نگرانی جانے تک نذر نیاز میں حصہ دار رہی ہے ۔

زمانی اعتبار سے شاکر اسی زمانے کے ہیں جو حضرت کے ان دو نواسوں کا رہا ہے ۔ جبکہ محمد عبد اللہ کی بجائے محمد عبدالشکور کا تخلص ہی «شاکر» مناسب معلوم ہوتا ہے

اس مفروضہ کو مزید تقویت اس سے بھی ملتی ہے کہ «دیوان شاکر» کے قلمی نسخہ کے ساتھ ، ایک قلمی نسخہ بھی ہماری خاندانی لائبریری میں موجود ہے ، جس پر «عبدالشکور» نام درج ہے ۔

یہ دوسرا قلمی نسخہ ایک عربی دعا کی شرح اور ترجمہ «فاتح الدعاء فی شرح سامع الدعاء»[۴] کے نام سے فارسی نثر میں ہے اس قلمی نسخہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ «عبدالشکور» کی تیسری تالیف «شرح اذان و اقامت و صلٰوۃ» کے نام سے موسوم تھی ، نیز انھوں نے ایک رسالہ «ظہر احتیاطی» کے موضوع پر علمائے بخارا کے جواب میں رقم کیا تھا[۵]

شیخ محمد عبداللہ کی کوئی تحریر ہمارے قدیمی ذخیرۂ کتب میں نہیں ملی ۔ گمان غالب ہے کہ شیخ محمد عبدالشکور ہی «شاکر» تخلص فرماتے تھے ۔ اس سے اُن کے فارسی اور اُردو (یا ہندوی) شاعر ہونے کے علاوہ ایک ناقد، شارح، مترجم اور فقیہہ ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے ۔

قدیمی قاعدہ رہا ہے کہ مرید اپنے روحانی سلسلے کے بیان کو ہمیشہ اپنے مرشد سے ابتداء کرتا ہے مثال : دیوان میں شامل منظوم شجرہ ۔

اس سے شاعر کا حضرت یحییٰ[۱] کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونا ثابت ہے ؎

شیخ یحییٰ قدوۂ اہل صفا
شیخ سعدی در حقیقت پیشوا
شیخ آدم شیخ احمد پیر اُو
خواجہ باقی خواجگی پیر ہدیٰ[۱]

ایک اور شعر میں شاعر نے حضرت یحییٰ اٹکی کو اپنا روحانی مرشد قرار دیا ہے ؎

که بود مرقد مرشد مرا درون اٹک
که خاک تربت اُو افسر است وتاج شہاں

حضرت یحییٰ اٹکی کا روحانی سلسلہ دو واسطوں سے حضرت مجدد الف ثانی سے جاملتا ہے، اس لیے شاعر کی بیعت نقشبندی سلسلہ میں ہونا ثابت ہے

فارسی کلام میں دو مناجات :

۱) مناجات در جناب پیر دستگیر قدس اللہ سرہ العزیز۔

۲) مناجات در جناب حضرت شاہ نقش بند مشکل کشا قدس سرہ العزیز شاعر کو نقشبندی صوفی ثابت کرتی ہیں۔

«در سلسلۂ مشائخ خود می‌گوید»، کے عنوان سے شاعر نے اپنے روحانی سلسلے کی تاریخ رقم کی ہے۔ اس روحانی سلسلہ کی ترتیب یوں ہے :

۱) حضرت شیخ یحییٰ اٹکی المعروف بہ جی بابا۔ م ۱۱۳۲ ھ ۱۷۱۶ ع۔

۲) شیخ سعدی لاہوری۔ م ۱۰۸۷ھ

۳) شیخ آدم بنوری م ۱۰۵۳ ھ

۴) شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی۔ م ۱۰۳۵ ھ۔

۵) خواجہ محمد باقی باللہ دہلوی۔ م ۱۰۱۲ ھ

۶) خواجہ محمد امکنگی۔ م ۹۷۰ ھ

۷) حضرت درویش محمد م ۹۷۰ ھ

۸) خواجہ محمد زاہد م ۹۳۶ ھ۔

۹) حضرت عبید اللہ احرار م ۸۹۵ ھ۔

۱۰) حضرت یعقوب چرخی م ۸۵۱ ھ۔

۱۱) حضرت خواجہ علاء الدین عطار م ۸۰۲ھ۔
۱۲) خواجہ بہاء الدین محمد نقشبند۔ م ۷۹۱ھ
۱۳) حضرت سید میر کلال۔ م ۷۷۲ھ۔
۱۴) خواجہ بابا سماسی م ۷۵۵ھ۔
۱۵) خواجہ علی رامیتنی۔ م ۷۲۱ھ۔
۱۶) خواجہ محمود انجیر فغنوی۔ ۷۱۵ھ۔
۱۷) خواجہ عارف ریوگری۔ م ۷۱۵ھ۔
۱۸) خواجہ عبد الخالق غجدوانی م ۵۷۵ھ
۱۹) خواجہ یوسف ہمدانی۔ ۵۳۵ھ۔
۲۰) حضرت بوعلی فارمدی ۴۷۰ھ۔
۲۱) شیخ ابوالحسن خرقانی۔ ۴۲۵ھ[٦]۔
۲۲) حضرت بایزید بسطامی م ۲۶۱ھ
۲۳) امام جعفر صادق۔ م ۱۴۰ھ
۲۴) امام قاسم۔ م ۱۰۷ھ
۲۵) حضرت سلمان فارسی۔ م ۳۲ھ۔
۲۶) حضرت ابو بکر
۲۷) حضرت محمــد

ـــہ
برآمدم زاتک از جفا و جور کساں
وطن نہ بود مرا بلکہ بود قبلۂ جاں
کہ بود مرقد مرشد مرا درون اتک
برآمدم چو بہ تقدیر ایزدی زاتک[۱]
شدم مقیم بہ نوشہرہ از جفائے زماں

مندرجہ بالا اشعار سے شاعر کے روحانی سلسلے اور اٹک میں اُن کے قیام

سے لے کر نوشہرہ کی طرف سفر کر جانے کے اشارے ملتے ہیں

شاعر کے جوانمرگ بیٹے کی معلوم تاریخ وفات سے شیخ محمد عبدالشکور شاکر کے اپنے زمانے کا تعین ممکن ہے۔ اور پتا چلتا ہے شاعر ۱۱۸۳ھ کے لگ بھگ اٹک[۷] میں مقیم رہے عہد مغلیہ میں دریائے سندھ کے کنارے یہ ایک بڑی آبادی تھی، جو اٹک قلعہ (اکبری عہد) کی قربت کی بنا پر اہم گزرگاہ اور فوجی چھاؤنی کی حیثیت رکھتی تھی اٹک کی اہمیت کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب ۹۸۹ھ میں جلال الدین محمد اکبر نے یہاں قلعہ تعمیر کروایا۔

محمد عبدالشکور شاکر، کے قیام اٹک کے زمانے کا اندازہ لگانے کے لیے ایک انگریز سیاح لیفٹننٹ ولیم بار کے سفرنامہ سے بہت مدد ملتی ہے۔ یہ سیاح محمد عبدالشکور شاکر کے آخری ایام یا رحلت کے کچھ ہی عرصہ بعد یعنی ۱۸۳۹ع میں دہلی سے کابل پر یلغار کے دوران کرنل ویڈ کا ہمسفر تھا۔ درۂ مارگلا سے گزر کر وہ اٹک جرد، دریائے سندھ کے کنارے پہنچتا ہے۔ سیاح ولیم بار لکھتا ہے۔

« میدانی علاقہ کے اختتام پر پہنچنے کے بجائے ایک ڈھلوان سے نیچے اُترنا پڑتا تھا، جس کے دونوں طرف کا منظر بڑا دلکش تھا۔ دور سے ایک پہاڑی سلسلہ نظر آتا تھا، جس میں کوہ ہندوکش کی برف پوش چوٹیوں سے لے کر اوسط بلندی کی اُونچی نیچی پہاڑیاں شامل ہیں، جو وادیٔ پشاور کو گھیرے ہوئے ہیں۔ دائیں طرف چھچھ کا وسیع گھیرے سبز رنگ کا سبزہ زار ہے جسے جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے ندی نالے قطع کرتے ہیں۔ بائیں طرف افغانستان کا بے آب و گیاہ بلند سلسلۂ کوہ ہے، جو کوہستان کٹک کہلاتا ہے (جو اس پہاڑی کی اوٹ میں ہے جس پر ہم کھڑے ہیں) ہمارے بالکل سامنے عظیم دریائے سندھ (جس میں برساتی پانی سے طغیانی آئی ہوئی تھی) ٹھاٹھیں مارتا ہوا بہہ رہا تھا۔ اس کے صاف شفاف پانی میں جگہ جگہ سنگین کناروں سے ٹکرانے کی وجہ سے جھاگ بھی اُبل رہے تھے، لیکن جہاں جہاں سورج کی شعاعیں اُسے چھو رہی تھیں، وہاں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چاندی پگھل کر بہہ نکلی ہو۔

جیسے ہی ہم ایک موڑ پر پہنچے یہ ساری قدرتی خوبصورتی ہماری نظروں سے یکایک غائب ہوگئی اور گرد و پیش کے حقائق نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ سڑک بے حد خراب تھی اور چھوٹے بڑے پتھروں سے پٹی پڑی تھی۔ ہمارے خیمے ایک پہاڑی پر ایک پکی سرائے[۸] کے مقابل نصب کیے گئے تھے لیکن ہم وہاں صرف اتنی دیر ٹھہرے کہ جلد جلد ناشتہ کرلیں کیونکہ ہمارے لیے فوراً دریا عبور کرنا انتہائی ضروری تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اٹک کے گورنر نے نہ صرف یہ کہ ہماری کسی قسم کی مدد کرنے سے انکار کردیا تھا، بلکہ ہمارے دستہ کو شہر سے گزرنے کی اس شرط پر اجازت دی تھی کہ اپنے ہتھیار شہر پناہ کے باہر ہی چھوڑ دیں۔

(ترجمہ: خواجہ عبدالرشید، "بیگم سرائے" ماہ نو، ۱۹۶۵ ع)

"بیگم سرائے" کے قریب (جہاں ولیم بار وغیرہم کے خیمے نصب کیے گئے) ہی وہ مقام ہے، جہاں سے دریائے سندھ کی جانب پہاڑی ڈھلوان پر حضرت یحییٰ اٹکی کا مزار واقع ہے۔ اس مزار کے قرب و جوار کی اراضی حضرت یحییٰ اٹکی کے سجادہ نشیں اور حلقساہ کی ملکیت رہی ہے۔ آج، حضرت یحییٰ اٹکی کے مزار کے پچھواڑے ہمارا خاندانی قبرستان دور تک پھیلا ہوا ہے سو یقیناً محمد عبدالشکور شاکر کا قیام بھی اسی علاقے میں رہا ہوگا۔

محمد عبدالشکور شاکر کا یہاں قیام ۱۱۸۳ ھ تک خود اُن کے کلام سے ثابت ہے۔ نیز یہ کہ شاکر نے حضرت شیخ یحییٰ اٹکی کی نگرانی میں نقشبندیہ سلسلے کے تصوف کی منازل طے کیں حضرت یحییٰ اٹکی کی رحلت ۱۱۳۲ ھ/۱۷۱۶ ع میں ہوئی تب شاکر نے یہ تاریخ نظم کی ہے

یک ہزار و صد و سی بود و دو در بالایش،
کہ رواں شد بسوئے غرب و صالش بہ خضوع!

قرائن بتاتے ہیں کہ اگر شاعر نے بیس پچیس برس کے سن میں بھی بیعت کی تو محمد عبدالشکور شاکر کی پیدائش کا زمانہ ۱۱۰۷ ھ سے ۱۱۱۲ ھ کے

الگ بھگ ہوتا ہے اور اگر تیس برس کی عمر میں پختہ شعور کے ساتھ بیعت کی تو زمانۂ پیدائش ۱۱۰۲ھ ۱۶۸۶ء ٹھہرتا ہے۔ اس طرح شاکر، ولی دکنی (پیدائش: ۱۶۶۸ء) کے سب سے قریبی ہمعصر تھے سید محمــــد فراقی (۱۰۹۷ھ ـ ۱۱۴۳ھ مطابق ۱۶۸۵ء ـ ۱۷۳۱ء) اور مــــرزا داؤد بیگ یا داؤد اورنگ آبادی (مطابق ۱۱۵۷ھ ۱۷۴۴ء) کے نام شاکر کے بعد لئے جائیں گے۔

محمد عبدالشکور شاکر کے دیگر حوالوں میں سے سب سے اہم حوالہ شیخ یحییٰ اٹکی المعروف بہ حی بابا کے خاندان سے ہوتا ہے۔ شیخ محمد یحییٰ اٹکی کی پیــــدائش موضع کامل پور (کیمبل پور چھاونی) حال اٹک کلاں سے دو میل کے فاصلہ پر چھوٹی روڈ کے کنارے واقع ”موضع سرواله“ کی ہے حضرت کے والد شیخ الیاس، دادا شیخ پیر دادا اور بڑے دادا شیخ ہویا، تینوں بزرگوں کے مزارات موضع ”سرواله“ میں واقع ہیں حضرت شیخ محمــــد یحییٰ بعد ازاں اٹک (حرد) تشریف لے گئے۔ ہجرت کے کچھ ہی عرصہ بعد حضرت کے دیگر اہل خانــــہ اٹک و انہی عام کا شکار ہوگئے، صرف دو بیٹیاں اور ایک بیٹا شیخ اسماعیل زندہ بچے جن کی کفالت کے لیے حضرت نے بطور اوہار محنت مشقت کو اپنایا، چکی پیسی بچوں کو پالا اور تربیت کیا حضرت کے فرزند شیخ اسماعیل لاولد تھے، البتہ خدا نے بیٹیوں کو اولاد سے نوازا

ماضی قریب میں ملا منصور (اٹک حرد) اور چار سدہ کے قرب و جوار میں آباد شیخ میاں رامدار ابن شیخ میاں محمــــد یار (بڑانگ چار سدہ) کی اولاد کے درمیان شیخ یحییٰ اٹکی کی جانشینی کے جھگڑے نے یہ ثابت کردیا ہے کہ حضرت یحییٰ اٹکی کی نسل آپ کے نواسوں سے آگے چلی، جن میں سے ایک شیخ محمد عبدالشکور شاکر تھے جبکہ ملا منصور کے موجودہ صاحبزادگان (میرے سگے ماموں اور ان کی اولاد) اس سلسلے کی آخری کڑیاں ہیں

قرائن بتاتے ہیں کہ حضرت یحییٰ اٹکی کے لاولد فرزند شیخ اسماعیل کی رحلت کے بعد شیخ محمــــد عبدالشکور شاکر درگاہ کے سجادہ نشین کے طور پر اٹک (حرد) میں آباد ہوئے [۹] چونکہ شیخ محمــــد یحییٰ اٹکی کا مزار زیارت گاہ

خلائق عامہ تھا اور حضرت کے مریدوں کی ایک بڑی تعداد تواتر کے ساتھ درگاہ پر حاضری دیتی تھی، اس لیے گمان غالب ہے کہ بطور سجادہ نشیں، شیخ محمد عبدالشکور شاکر کی گزر بسر، نذر نیاز اور تحفہ تحائف پر ہی تھی، اُن کا کنبہ ایک بیوی اور دو بچوں (ایک لڑکا ایک لڑکی) پر مشتمل تھا، شاکر، اٹک میں کچھ خوش نہیں تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو پردیسی اور بے یار و مددگار تصور کیا، نیز یہ کہ وہ کچھ لوگوں سے آزردہ خاطر رہے اور پریشان خاطر بھی، اسی لیے وہ اٹک چھوڑ کر نوشہرہ میں قیام پذیر ہوئے ؎

برآمدم زاٹک بافغان بہ نوشہرہ
رسیدہ ام کہ گرینم امان بہ نوشہرہ

ایک اور شعر میں شاکر نے اٹک چھوڑنے کی دو وجوہات، (۱) تقدیر ایزدی (۲) زمانے کی جفا، بتائی ہیں۔ «تقدیر ایزدی» سے مراد ان کی رفیقۂ حیات کی ناوقت موت ہے۔ جہاں تک «زمانے کی جفا» کا تعلق ہے، گمان غالب ہے کہ اٹک سے نوشہرہ منتقل ہونے کا یہ دوسرا سبب اپنے قریبی اعزاء کے ساتھ سجادہ نشینی کے معاملے پر ابہام و تفہیم میں ناکام تھی جس طرح ماضی قریب میں موضع ملا منصور کے صاحبزادگان اور دریا پار والوں میں ہمیشہ نذر نیاز اور تحفہ تحائف پر بحث و تکرار ہوتی رہی ہے، بعینہٖ یہی صورت پڑانگ، چار سدہ میں مقیم خالہ زاد بھائیوں کے ساتھ شیخ محمد عبدالشکور شاکر کی بھی رہی ہوگی۔ بہت ممکن ہے کہ یہ چپقلش سگے بھائی محمد عبد اللہ کے ساتھ رہی ہو شکستہ دل شاکر اپنی رفیقۂ حیات کی وفات کے بعد اپنے جوان سال بیٹے کے ہمراہ اٹک سے نوشہرہ منتقل ہوگئے مگر ۱۱۸۶ ھ/۱۷۷۲ ع میں قدرت نے اُن سے زندگی کی یہ عزیز ترین متاع بھی چھین لی ؎

بود از ہجرت ہزار و یک صد و ہشتاد و شش
چار شنبہ وقت پیشیں قطع شد لخت جگر

رفیقۂ حیات کی ناوقت اور بیٹے کی ناگہانی موت کا غم شعر کے قالب میں

ڈھلتا رہا ---- ۔

نیست طاقت تاکشایم را کشایم حال من
یادم آید آن سبق، می ریختی شہد و شکر
بعد تدفین اش بخانہ چوں رجوعی ساختم
اشک ریزاں، دلِ کباب از غصہ خونم شد جگر

"مرثیہ بر مرگ رن و فرزند خود" بیالیس اشعار کا مرثیہ، دس دیگر فارسی مرثیوں کے علاوہ ہے، جن میں شاکر نے اپنی شریک حیات اور جوانمرگ بیٹے کو یاد کیا ہے شاکر زمانے کے ستائے ہوئے انسان تھے، جوان بیٹے شیخ احمد کی ناگہانی موت نے ہر طرف اندھیرا کر دیا۔ اُن کی چار بیٹیاں تھیں :

(۱) شمس النساء زوجہ محمد موسیٰ ساکن میاں گوحر
(۲) قمر النساء زوجہ محمد عیسیٰ ساکن میاں گوحر
(۳) آفتاب النساء
(۴) بدر النساء (جو پڑانگ میں بیاہی گئیں)

یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ شاکر کب نوشہرہ سے دوبارہ اٹک آکر آباد ہوئے۔ دوسری بار اٹک میں اُن کا قیام آخیر تک رہتا ہے۔ آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں محض اندازہ ہی کیا جاسکتا ہے

بہت پہلے، جب میرے ننھیال کے خاندانی قبرستان میں مجھے شیخ محمد عبدالشکور شاکر کے مزار کی نشاندھی کرائی گئی تھی۔ اُس زمانے میں مزار کے سرہانے سنگ مرمر کا نصف ٹوٹا ہوا کتبہ بھی نصب تھا افسوس کہ اس زمانے میں کتبہ پر درج ادھوری عبارت محفوظ کرنے سے رہ گئی اب کتبہ کا بقیہ حصہ بھی محفوظ نہیں رہا، محض آثار رہ گئے ہیں۔

حضرت شیخ محمد یحییٰ اٹکی کے دربار کے پچھواڑے، پختہ دیواری میں واقع شیخ محمد عبدالشکور شاکر کے مزار پر آج بھی علاقہ چھچھ اور فرنٹیئر کے لوگ بڑی تعداد میں حاضری دیتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ شاکر کے نام اور کام

سے سراسر ناواقف ہیں۔ شاکر کے متعلق یہ مشہور ہے کہ آپ پہنچے ہوئے صوفی بزرگ تھے، نیز ایک خاص وجہ سے بھی آپ کا مزار علاقہ چھچھ اور فرنٹیئر کے لوگوں کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا ہے اور وہ یہ کہ جو بچہ مٹی پھانکتا ہو، اس کی یہ بری عادت بچہ کو آپ کے مزار پر حاضر کرنے سے چھوٹ جاتی ہے۔

دیوان شاکر میں شامل دو فارسی اشعار میں معز نامی کسی شاعر کو مخاطب کیا گیا ہے ؎

شاکر مرا معز شدہ جالب دریں خیال
زاں دور ماہ، ریشۂ سنبل گرفتہ است		(صفحہ ۲۶)

شاکر مرا معز شدہ باعث وگریہ کے
خواہم کہ تا سخن زمن داد شود بلند		(صفحہ ۴۱)

عبدالحلیم اثر افغانی کی تحقیق کے مطابق، [۱۰] "معز" سے مراد ارباب معز اللہ خان، ابن عبداللہ خان، ابن محمد خان، ابن مستجاب خان، ابن آزاد خان، ابن محبت خان مہمند ہے۔ یہ شجرہ تاریخ پشاور طبع ۱۸۷۲ع صفحہ ۶۳۵ (تالیف رائے بہادر گوپال داس) میں درج ہے۔ ارباب معز اللہ خان پہلے پیشاور کے مضافات میں مقام "سربند" سکونت رکھتے تھے اور بعد میں آپ کی نسل کے لوگ، جیسا کہ ارباب غلام حیدر خان ولد نعیم اللہ خان ولد ارباب معز اللہ خان مذکور کی ایک دستاویز سے ظاہر ہوتا ہے پشاور شہر کے ایک بیرونی محلہ کوٹلہ ارباب محسن خان میں مقیم ہو گئے تھے"

اثر افغانی کے بیان کے مطابق ارباب معز اللہ خان اپنے پشتو اشعار میں معز اللہ اور معز اور فارسی، اردو اشعار میں افغان تخلص کرتے تھے۔ وہ اپنے وقت کے درسی علوم، تفسیر، فقہ، حدیث، فلسفہ (علم کلام۔منطق) علم بیان، علم بدیع، علم معانی کے فاضل تھے۔ پشتو میں آپ کا ایک دیوان یادگار ہے۔

معز اللہ خان، صوفی سلسلے نقشبندیہ میں حضرت میاں صاحب محمد عمر چمکنی کے نمایاں اور محبوب مرید تھے۔ اثر افغانی کے بیان کے مطابق وہ اپنے پیر طریقت کے سفر اور حضر کے شریک تھے۔ جب کبھی حضرت میاں صاحب محمد عمر چمکنی

اپنے پیر طریقت حضرت شیخ محمد یحییٰ الکی کی خدمت میں الگ حاضری دیتے تو ارباب معز اللہ خان بھی ان کے ساتھ ہوا کرتے تھے اور بمقام الگ شاکر اور معز کی روحانی، علمی اور ادبی صحبتیں رہتیں ۱۱

دیوان شاکر کے صفحہ ۲۸ پر ایک فارسی غزل کا مقطع ہے ؎

بہر خاطـــــر داری دلریش شاکر ذو رقم
ایں غزل مطبوع و رنگیں را کہ صد دلہا گرفت

عبدالحلیم اثر افغانی کی تحقیق کے مطابق دلریش بھی معز کی طرح ایک اور ہمعصر شاعـــــر کا تخلص ہے۔ جس کا پورا نام سید علی نور ترمذی تھا۔ یہ بھی میاں صاحب محمد عمر چمکنی کے مرید خاص تھے فارسی اشعار میں دلریش تخلص کرتے تھے اثر افغانی کا دعویٰ ہے کہ سید علی نور ترمذی دلریش صاحب کا قلمی دیوان ان کے پاس محفوظ ہے۔

اس طرح "دیوان شاکر" کے صفحہ ۸۹ پر پینتیس اشعار کی ایک مختصر مثنوی "نامۂ منظوم" کے عنوان سے شامل اشاعت ہے۔ جس کا آخری شعر ہے ؎

غلط است ایں کہ گفتمت یا راست
باش منصف بگوئے بے کم و کاست

اثر افغانی نے اس منظوم خط کے مکتوب الیہ سے بھی ادبی دنیا کو متعارف کروایا ہے جیسا کہ ظاہر ہے یہ خط منصف نامی کسی شاعر کے نام ہے۔ اس سلسلے میں بات کرتے ہوئے اثر افغانی نے بتایا کہ

تقریباً چالیس سال پہلے جب وہ علاقہ چھچھ (ضلع کیمبل پور) کے موضع برلوبہ میں مقیم تھے تو وہاں کتاب "سیرۃ النبی" تالیف محمد ابن الحردی والشافعی کا ایک نسخہ ہاتھ آیا، جو تاحال ان پاس محفوظ ہے اس کتاب پر ایک بیضوی مہر ثبت ہے جس کی عبارت ایک فارسی شعر پر مشتمل ہے ؎

منصف ایں طرفہ نسخہ دلخواہ
وقف شد خالصاً لوجہ اللہ
(۱۱۰۰ھ)

قرطوبہ سے دستیاب ہونے والی اس کتاب کے وقف کرنے والے کا نام منصف ہے اور چونکہ شاکر اور منصف دونوں کا زمانہ بھی تقریباً ایک ہی ہے، اس سے گمان غالب ہے کہ شاکر کا یہ «نامۂ منظوم» اپنے ہمعصر شاعر منصف کے نام ہے۔

دیوانِ شاکر کی ان الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے کے سلسلے میں عبدالحلیم اثر افغانی کا مقالہ ہما حط ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے، لیکن مجھے ان کے اس نظریہ سے اتفاق نہیں کہ شاکر نسلاً سید یا سادات سے تھے اور ان کا زمانہ ۱۱۴۳ھ یا ۱۷۴۹ع کا ہے۔ نیز ان کا یہ مفروضہ بھی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ شاکر، شیخ محمد یحییٰ اٹکی کے پیر بھائی تھے اور اُسی نسبت سے حضرت میاں صاحب محمد عمر چمکنی کے قریب تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاکر کا حضرت یحییٰ اٹکی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونا ثابت ہے اس سلسلے میں «دیوانِ شاکر» میں شامل منظوم شجرہ کے اولین دو اشعار ملاحظہ ہوں۔ نیز یہ کہ جہاں شاعر کہتا ہے کہ ع

که بود مرقد مرشد مرا درون اٹک

تو اس سے «پیر بھائی» نہیں بلکہ «مرشد» ہی مراد ہے۔

یہاں یہ وضاحت کردینا بھی ضروری ہے کہ ملا منصور صاحبزادگان کے ہاں سے شاکر اور عبدالشکور کے باہم شعری رشحات قلم برآمد ہوئے۔ [12] ان دو قلمی نسخوں کے علاوہ دیگر نوادرات [13] کا ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ صدی کتب و رسائل نسل در نسل منتقل ہوئے۔ نیز یہ کہ صاحبزادگان کا شجرہ نسب «دیوانِ شاکر» کے منظر عام پر آنے کے بعد مرتب نہیں ہوا۔ ایک شاعری کی کتاب کی بہ نسبت شجرۂ نسب زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

(۲)

"دیوانِ شاکر" کا قلمی نسخہ گہرے بادامی رنگ کے خستہ کاغذ پر جلی نستعلیق میں خوشخط رقم ہے اور درمیانہ تقطیع کے چھیانوے صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ دستاویز قرائن و آثار سے گو تقریباً دو سو سال پرانی محسوس ہوتی ہے، لیکن کلام (خصوصاً فارسی کلام) کو نقل کرتے وقت املا کی اغلاط یہ ثابت کرتی ہیں کہ نسخۂ مذکور، شاعر کے ہاتھ کی تحریر نہیں، اور نہ ہی یہ نسخہ شاعر کی نظر سے گزرا۔ گمان غالب ہے کہ شاعر کی رحلت کے بعد شاعر کی غیر موجودگی میں بیاض شعری سے نقل کیا گیا۔

مطبوعہ "دیوانِ شاکر" کی ترتیب بھی چودھری غلام محمد (قلمی نام: نذر صابری) کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اصل مسودہ میں کلام یکجا تو ہے لیکن مرتب صورت میں نہیں۔

اس اہم دستاویز کو محفوظ رکھنے کے معاملے میں توجہ نہیں برتی گئی، جس کے نتیجہ کے طور پر قلمی نسخہ کے ابتدائی چند اوراق محفوظ نہیں رہ سکے۔ نسخہ ترقیمہ سے خالی ہے، یہاں تک کہ مشمولہ اولیں مرثیہ بھی ادھورا رہ گیا۔ موجودہ صورت میں یہ قلمی نسخہ مندرجہ ذیل شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

نام ہر یک حجرہ بنہاد و حراماں شد چو سرو
نقش گل گشتے ہویدا از قدومش سر بسر

ابتدا میں گیارہ مرثیے (یا نوحے) اور ۷۶ فارسی غزلیات ایک تسلسل میں درج ہیں جب کہ فارسی کی ۳۱ مزید غزلیں اور دیگر تمام (عربی۔فارسی۔اردو) اصناف سخن غیر مرتب حالت میں ہیں۔ بقول نذر صابری:

گمشدہ ورق کو حضرت جی بابا کے خاندانی کتب خانہ واقع ملا منصور (اٹک) میں جہاں یہ نسخہ ابا عن جد محفوظ چلا آرہا ہے۔ تلاش کیا گیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔

دیوان کو مرتب کرتے وقت ایک ہی نسخہ ہمارے سامنے تھا، جو اگرچہ خوشخط تھا، مگر سہو و تسامح کی مثالوں سے پر تھا۔ تاہم اس کی تالیف و تدوین اور تہذیب و تنقیح کے سلسلے میں امانت و دیانت کے اصولوں کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

«چودہ اشعار کے ایک قطعہ کے سوا، جس میں ایک فقہی مسئلہ بیان ہوا ہے۔ کسی ایک شعر کو بھی خواہ وہ فکر و فن کے اعتبار سے کتنا ہی افلاس زدہ کیوں نہ ہو قلم زد نہیں کیا گیا۔» (مقدمہ سے اقتباس)

شاکر نقشبندی مسلک کے صوفی شاعر ہیں۔ ان کی فارسی اور اردو غزل میں معرفت کے مضامین کے ساتھ حسن و عشق کا مضمون بہت شوخ رنگوں میں اپنی پہچان کرواتا ہے البتہ ان کا شعری رویہ حریص اور مکار دنیادار شاعروں سے یکسر مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام ابہام اور ذو معنی الفاظ کے مکار اشارات سے بڑی حد تک پاک ہے۔ شاکر اپنے زمانے کے دیگر صوفی شعراء کی طرح عوام میں گھل مل جانے کا جتن کرتے ہیں اور دنیاداروں سے الگ تھلگ رہنے کی خواہش۔

عصری عطا، شاکر کے ہاں دیگر صوفی شعراء اور قریبی ہمعصر ولی دکنی کے تنزیہی رجحان کی ایک صورت مشابہتوں میں مبالغہ آرائی، لا انتہائیت اور ماورائیت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاکر اپنی فارسی اور اردو شاعری میں عراقی طرز کے دلدادہ ہیں اور عراقیوں میں بھی ان کا رنگ جامی کے رنگ سے قریب ہے۔ ان کے ہاں بھی عارض و رخسار کا تفصیلی بیان ہے اور ستائش حسن کا وہی والہانہ پن۔ سو توصیف کے ترانے میں حسن کے لخت لخت اجزاء پر زور دکھائی دیتا ہے اور حسن کے مجموعی تاثر کی جھلکیاں بہت کم ہیں۔

اس شعری ہنت میں بھی حسن محبوب کو حسن فطرت سے آہنگ کر کے فطرت کی مشابہتوں کو واضح کیا گیا ہے ـــــ

تجھ لب کوں کوئی مرجان کہتا کوئی لعل بدخشاں کہتا
کوئی شربت رُماں کہتا کوئی کچھ کوئی کچھ کہتا

شاکر کا اردو کلام بہت کم تعداد میں دستیاب ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود شاکر کی تشبیہات کی فہرست ولی دکنی، سید محمد فاروقی، داؤد اورنگ آبادی، سید محمد فاخر، سید شاہ حسین ذاکر وغیرہم کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسعت کی حامل ہے۔

لب محبوب کو یاقوت یا مرجان اور چشم محبوب کو چشم آہو یا نرگس جادو سے مشابہت دینے میں شبہ کو جو ترجیح حاصل رہی ہے اس کو میر، غالب اور فیض کا ذوق شعری (یا ذوق جمال) گوارا نہیں کرتا۔ لیکن شاکر اپنے ہمعصر ولی دکنی کی طرح شعری صداقتوں کے پابند دکھائی دیتے ہیں اور حسن محبوب کی تصویر کشی کرتے وقت فطرت کے بزول حسن سے مشابہتوں کے ذریعے محبوب کے "مثی ایچر" میں قوس قزح کے رنگ بکھیرتے ہیں ؎

تجھ قد کوں کوئی بالا کہتا کوئی شمشاد سلیق اُولا کہتا
کوئی موسوی عصا کہتا کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا
مجھ شاکر کوں کوئی طرار کہتا یار وفادار کہتا
کوئی عاشق عیار کہتا کوئی کچھ کوئی کچھ کہتا

مقطع خصوصی توجہ کا طالب ہے کہ اس میں مشابہتوں کا ایک نیا نظام موجود ہے۔ بیت کی سطح پر یہ محبوب سے مکالمہ بھی ہے اور لاؤڈ خود کلامی بھی۔ ہر دو صورتوں میں یہ عشق اور ہوس کے دو باہم الجھے ہوئے رویوں میں سے نزول عشق کی پہچان ممکن بنانے کا جتن ہے۔ یہ مشکل مرحلہ اس لیے بھی ہے کہ شاعر کو کوئی تو عاشق عیار کہتا ہے اور کوئی "یار وفادار" کہتا ہے۔ ایک طرف زمانہ ہے اور دوسری طرف شاعر۔

شاکر کی تمام تشبیہات نئی تو نہیں کہی جاسکتیں، لیکن تشبیہوں کا عموماً "آرائشی ہونا" اور تشبیہ کے ورتارے میں جدت کا عنصر انہیں اپنے معاصرین

میں یقیناً معتبر ثابت کرتا ہے۔

ولی دکنی اور شاکر کے عاشقانہ، نیز شعری رویہ کا تقابلی جائزہ لینے کے لیے مندرجہ بالا مقطع کا گہری نظر سے جائزہ لینا مناسب رہے گا۔ یہ جائزہ شاکر کے عشق کو پاکباز اور آنکھ سے زیادہ دل سے متعلق ظاہر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ولی دکنی کے «شک اور لامرکزیت» کی بجائے شاکر کے ہاں «ارتکاز» کی کیفیت بہت نمایاں ہے ؎

گرمی سوں وہ پری رو جب شعلہ تاب ہووے
پر جاہے دل جلوں کا سینہ کباب ہووے (ولی دکنی)

تپا ہے سینہ جدائی کی آگ میں جوں تنور
جگر کباب ہوا، رحم کر جدائی ہے (شاکر)

ولی دکنی کے مصرع ثانی میں شک کی کونپل پھوٹتی ہے جبکہ شاکر کے ہاں شک کی بجائے واقعیت اور قطعیت نمایاں ہے۔

شاکر کی اردو غزلیات میں جانی تمن، تجھ لب، تیری کمر، تجھ مژگاں اور «توں» کے ندائیہ الفاظ کی تکرار سے اس کا عشق، جنوں کی حدود کو چھوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح شاکر کی فارسی اور اردو غزل مترنم اور رواں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کے سوز و گداز کی حامل ہے، جس میں تغزل، جذب و کیف کی فضا بندی کرتا ہے۔

شاکر کو لفظوں کی نشست اور تراکیب بندش اور چستی پر خاص دسترس حاصل ہے، نیز یہ کہ ان کی اکثر فارسی غزلیں مشکل زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ اس کے باوجود شاکر کے کلام میں شعری بُت اور محاورے کے ورتارے کی متعدد مثالوں کا پایا جانا اپنی جگہ حیرت کا باعث بنتا ہے۔ محض چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

تجلی کن بریں اذنب تجلی!
تحلی کن برایں ارجی تجلی![14]

منم در وعدہ ہائے تو مصدق
بہ تصدیقِ مکمل نز مصدق [۱۵]

کہ درکن می شود بیمار سالم
ازاں «کن» کردۂ ایجا دعالم [۱۶]

(مناجات در باری تعالیٰ)

بحریم محفل میکشاں چو صبا وزم در پیچ و تاب
بامید آنکہ بجام مے چو ہوا شوم بیاں حباب [۱۷]

شعری بنت اور محاورے کے غلط ورتارے کے دیگر متعدد مثالوں کی طرف «دیوانِ شاکر» کے مرتبین نے فٹ نوٹ میں اشارے کیے ہیں۔

اب چلتے چلتے شاکر کے اردو کلام میں متروکات کا ذکر بھی ہوجائے۔ «متروکات» کی مندرجہ ذیل فہرست شاکر کو ولی دکنی کا ہمعصر اور شاکر کی زبان اور اسلوب کو «اردو کا پولھوباری روپ» ثابت کرتی ہے۔ قدیم گجرات کے گجراتی اور دکن کے دکنی روپ کے ساتھ اردو یا ہندوی زبان کا یہ «پولھوباری روپ» محققین اور ماہرین لسانیات کی توجہ کا طالب ہے ؎

تجھ سار کی چھبلی اندر جہاں نہوگی
تیری کمر سی لاں جگ میں نہیں کو ثانی
جانی تمن کی صورت اندر جہاں نہ ہوگی
تجھ سی ادا جو جانی کوئی کدھاں نہ ہوگی
زود آ وگرنہ تن موں یہ ذرہ جاں نہ ہوگی
جگر کباب بھیا رحم کر جدائی ہے
کہ کہنی سکنی ببیں سنی سیں یہ نیاری ہے
جوں توں بھی موں سیں ایسی کیتی کونری میرا میت

گو شاکر کی تینوں اردو غزلوں اور ایک دوہے میں فکر عمیق اور فلسفیانہ

گہرائی نہیں ملتی لیکن فارسی کلام میں افکار و مسائل اور ان پر ارتکار کی نادر مثالیں موجود ہیں۔ ایک جہان معنی ہے، جس میں صوفیانہ افکار، تصوف کے مراحل، فناء بقا اور تسلیم و رضا کے دفتر ہیں جو ناقدین فن کی توجہ چاہتے ہیں۔

آخر آخر میں شاکر کی تین اردو غـــزلیں اور ایک دوہا (کل اردو کلام) قارئین کی نذر ہے۔

شاکر الکی کے یہاں ہمیں ہندی اور فارسی اوزان کی ملی جلی صورت دکھائی دیتی ہے۔ یوں دونوں اوزان میں کسی ایک مخصوص نظام کے تحت انہیں پرکھنا مناسب نہ ہوگا۔ دوسری طرف شاکر الکی نے جہاں فارسی تراکیب (از قسم: لعلِ بدخشاں، زینتِ ابرو) برتی ہیں، وہیں ہندی تراکیب اور لفظیات کا ورتارا بھی دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ کچھ مقامات پر تو ہندی اور فارسی الفاظ کو جوڑکر تراکیب بنائی گئی ہیں جیسے «چلۂ دنک» اور «سیب مربا» کی تراکیب۔ بعد ازاں استاد ناسخ نے اس انداز کو شجر ممنوعہ قرار دیا۔

(۱)

تجھ مکھ کوں کوئی سریجن کہتا کوئی حسن کا چمن کہتا
کوئی راجہ دکھن کہتا کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا
تجھ لب کوں کوئی مرجاں کہتا کوئی لعل بدخشاں کہتا
کوئی شربتِ رماں کہتا کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا
تجھ مُژگاں کون کوئی ناوک کہتا کوئی نین کوئی پلک کہتا
کوئی چلۂ دکن کہتا کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا
تجھ چشم کوں کوئی آہو کہتا کوئی نرگس جادو کہتا
کوئی زینتِ ابرو کہتا کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا
تجھ ذقن کوں کوئی چہہ کہتا کوئی حسن کا شہنشہ کہتا
کوئی سیبِ مربا کہتا کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا

تجھ خال کوں کوئی سپند کہتا کوئی دانۂ کمند کہتا
کوئی عاشقاں کا دلبند کہتا کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا
تجھ قد کوں کوئی بالا کہتا کوئی شمشاد سابق اولا کہتا
کوئی موسوی عصا کہتا کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا
مجھ شاکر کوں کوئی طرار کہتا کوئی یار وفادار کہتا
کوئی عاشق عیار کہتا کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا

(۲)

بایں جمال و خوبی کوئی دلستاں نہو گی
تجھ سار کی چھبیلی اندر جہاں نہو گی
« تیری بین کی در سیں وہی نرک جنگل میں »
جانی تمن کی صورت اندر جہاں نہو گی
تیری کمر سی لالن جگ میں نہیں کو ثانی
باللہ کہ جگ میں ایسی کوئی مومیاں نہو گی
تجھ سی نہیں کوئی نارک واللہ میانِ عالم
تجھ سی ادا جو جانی کوئی کدھاں نہو گی
تیری نگہ گرم سیں آتش کو عرق آوے
بیشک کہ تجھ سی صورت در انس و جاں نہو گی
جانی تیرے درس کوں بسمل ہوا ہے شاکر
زود آ وگرنہ تن موں یہ ذرہ جاں نہو گی

(۳)

نہیں کوئی جگ میں تیری سار کی دہائی ہے
خلاف اس میں کذب اور روسیاہی ہے

تیرے نین کی سیاہی کجل کو سمجھے لوگ!
نجانتے ہیں یہ مور کھہ کہ یہ عطائی ہے
تپا ہے سینہ جدائی کی آگ میں جوں تنور
جگر کباب ہیا رحم کر جدائی ہے
تیرے لبوں کی پیاسی ہماہی آبِ حیات
حیات ان کی تیرے آگے جانفزائی ہے
سبھوں دکھوں میں جدائی کا دکھ بڑا ظالم
دلوں کی نیش ری کوں یہ دکھ دکھائی ہے
تیرے حسن کی صفت میں کیا کہئے شاکر
کہ کہہ سکی ہیں سدھ میں یہ نیاری ہے

دوھا

انہکتہ موں میں جگ رکھے اور کوئی نہ راکھے پریت
جو توں ہی موں میں ایسی کیتی تو کوں ری میرا میت

حوالاجات و حواشی

۱ ـ مراد، محمد عبدالشکور شاکر۔ واضح رہے کہ شاکر ناجی بعد کے شاعر ہیں۔
۲ ـ «در سلسلۂ مشائخ خود می گوید» شمولہ «دیوان شاکر» صفحہ ۱۱
۳ ـ «احوال» مشمولہ «دیوان شاکر» ار ڈاکٹر سعداللہ کلیم، «تاریخ ادب اردو» از ڈاکٹر جمیل جالبی اور «پاکستان میں فارسی ادب، (جلد اول) ار ڈاکٹر ظہور الدین احمد میں شاکر کو حضرت یحییٰ الکی کا پوتا ثابت کیا گیا ہے، جو درست نہیں
۴ ـ یہ دعا حضرت علی سے منسوب ہے۔
۵ ـ دونوں نالیفات کا ناحال کوئی سراغ نہیں ملا
٦ ـ نعیم شاہ نعیم، موضع ماشو گگر ڈاک خانہ بڈھ بیر، ضلع پشاور کے مطابق حضرت بوعلی قارمدی کے مرشد قاسم گرگانی تھے اس کے ثبوت میں نعیم

صاحب نے ایک منظوم شجرہ کا عکس بھجوایا۔

۷ ۔ اٹک خرد، مغلیہ عہد میں اٹک خرد اہم گزرگاہ ہونے کے حوالے سے اہمیت رکھتا ہے۔ انگریزوں کے زمانہ میں اٹک خرد ضلع کا درجہ رکھتا تھا اور کیمبل پور (حال: ضلع اٹک) اس کی ایک تحصیل تھی۔ مرور زمانہ سے آج کیمبل پور (یعنی ضلع اٹک) اٹک کلاں ہے اور اصل اٹک شہر «اٹک خرد» کہلاتا ہے

۸ ۔ بیگم سرائے ۔ آر۔ ای۔ ایم وہیلر مصنف «پاکستان کے پانچ ہزار سال» (مطبوعہ رائل انڈیا اور پاکستان سوسائٹی، لندن مطبوعہ: ۱۹۵۰ ع صفحہ ۹۳) کے مطابق اس نوع کی سرائیں، جرنیلی سڑک پر ہر بارہ میل کے فاصلہ پر قائم ہیں۔

۹ ۔ دوسرے بھائی شیخ محمد عبداللہ، موضع «صاحو» میں ہی مستقل طور پر رہے اور دربار کی تدریس اور برابر کے حصہ دار تھے۔

۱۰۔ گیارہ صفحات پر مشتمل مقالہ نما خط مرقومہ ۳ اکتوبر ۱۹۷۰۔ گورنمنٹ کالج کیمبل پور کے ایک ادبی اجتماع میں پڑھ کر سنایا گیا۔

۱۱۔ آپ نے طویل عمر پائی۔ ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۱۰ع تک یقیناً حیات تھے۔ اثر افغانی کے مطابق موضع سید شریف ضلع پشاور کے گیلانی سادات کی ایک خاتون کے زیورات کی وراثت کے ایک فیصلہ پر یہ الفاظ درج ہیں: «ارباب عمر اللہ حساب مہمند بقلم خود ۱۲۲۴ھ» — ساتھ سرکاری مہر ثبت ہے کہ عمر اُن دنوں حاکم شہر تھے۔

۱۲۔ «دیوان شاکر» اور فاتح الدعاء فی شرح سامع الدعاء» کے قلمی نسخے۔

۱۳۔ حضرت شیخ محمد یحییٰ' اٹکی المعروف جی بابا کا پلنگ اور عصا مبارک، تاحال موضع ملا منصور کے صاحبزادگان کے پاس محفوظ ہیں۔

۱۴۔ قافیہ ندارد ۱۵۔ قافیہ ندارد ۱۶۔ قافیہ ناقص

۱۷۔ «در پیچ و تاب» اضافت کے ساتھ پڑھا جائے گا، لیکن اس سے ترکیب مہمل ہوکر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح مصرع ثانی میں ترکیب فک اضافت، ذوق سماعت پر گراں گزرتی ہے۔

• • •

راجستھان میں اردو زبان و ادب
کا آغاز و ارتقا

از

ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی (ٹونک)

راجستھان میں اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقاء کا تجزیہ اس خطے میں فارسی زبان و ادب کے تاریخی پس منظر کی معلومات کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلئے کہ فارسی کی ترویج کے باعث یہاں اردو کے لئے ایسی راہیں کھلتی رہیں جن پر کاروانِ ادب آگے بڑھتا رہا اور دہلی اور لکھنؤ کی شعری روایات یہاں پھیلتی رہیں۔ اور جابجا چھوٹے چھوٹے ادبی گہوارے بنتے گئے۔

فارسی کے اس پس منظر کی تصویر کشی کے لئے ہمیں راجستھان کی تاریخ کے پچھلے صفحات پر نظر ڈالنی ہوگی اور یہ دیکھنا ہوگا کہ یہاں فارسی زبان و ادب کے اثرات کب سے پہنچنے لگے تھے اور وہ کس طرح فروغ پاتے رہے۔ اسلئے کہ یہاں فارسی کے مخطوطات و مطبوعات اور فرامین و دستاویزات ہی نہیں مساجد و مقابر اور قلعہ جات و عمارات وغیرہ کے در و دیوار پر کندہ کتبات اور تحریری عبارات فارسی زبان کی ادبی وراثت کے ایسے بیش بہا خزائن و ذخائر بھی ہیں جن میں اسلامی علوم و فنون کے علاوہ ہندوستان کی ہزار سالہ تاریخ و ثقافت، علم و ادب اور تہذیب و تمدن سے متعلق نادر و نایاب شہپارے چھپے ہوئے ہیں اُن کی صورت گری کا سلسلہ اسی زمانے سے شروع ہوا جب سے فارسی بولنے والے صوفی، سوداگر اور سپاہی ہندوستان میں آنے جانے لگے۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ سلسلہ ۱۰۰۰ ع میں سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملوں کے ساتھ ساتھ شروع ہوگیا تھا وہ ۱۰۰۸ ع میں اجمیر پہنچا تھا۔[۱] اسکے بعد ۴۲۴ ھ مطابق ۱۰۳۲ ع میں سالار مسعود شہید کے موجودہ الور کے علاقے میوات تک پہنچنے کے اشارات ملتے ہیں۔[۲] گویا تاریخی اعتبار سے ہم اس زمانے کو پانچویں صدی ہجری یعنی

---

۱ تاریخ اجمیر مرتبہ مہاراج کشن مطبوعہ ۱۸۷۶ ع ص ۱۲۲

۲ حیاتِ کــرم حسین مصنفہ حکیم ظل الرحمٰن مطبوعہ کار پرنٹرس علی گڑھ۔ ۱۹۸۳ ع ص ۲۵

گیارہویں صدی عیسوی کا ابتدائی زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ الور کے قصبہ تجارہ اور دوسرے مواضعات میں صوفیوں، درویشوں اور سپاہیوں کی آمد کا ثبوت اس خطے کے قدیم مزارات سے ملتا ہے۔ اسی طرح بھرت پور کے قصبہ بیانہ میں بھی قدیم مزارات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ وہاں بھی فارسی بولنے والے حضرات کی آمد کا سلسلہ بہت قدیم ہے۔

۴۸۶ھ مطابق ۱۰۹۳ع میں صوفیوں کی ایک جماعت اس خطے میں آئی تھی ان میں سید روشن علی نے اجمیر میں، سید طاہر مشہدی نے کھاٹو (مارواڑ) میں، سید اسں مشہدی نے ڈیدوانہ (مارواڑ) میں اور سید حمیدالدین ریحانی نے ناگور میں قیام فرمایا تھا [1]

صوفیوں اور درویشوں کی راجستھان میں آمد کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا چنانچہ چھٹی صدی ہجری میں ۵۶۱ھ مطابق ۱۱۶۵ع میں قاضی شیخ حمیدالدین ناگور میں تشریف لائے۔ آپ صاحب تصنیف عالم تھے۔ «طوالع الشموس» آپ ہی کی تصنیف ہے۔ ناگور میں قیام کے زمانے ہی میں آپ کا نکاح ہوا کچھ عرصہ بعد آپ دہلی تشریف لے گئے مگر افراد خاندان وہیں رہے۔ اُن ہی میں آپ کے صاحبزادے قاضی شیخ ظہیرالدین کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جن کی تصنیف «روضۃ الصوفیہ» [2] کو راجستھان میں فارسی کی اولین تصنیف ہونے کا فخر حاصل ہے اس خاندان میں فارسی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا چنانچہ قاضی نجیب الدین مصنف «مناقب حمیدیہ»، قاضی برہان الدین مصنف «برہان العاشقین» اور قاضی رحمت اللہ مصنف «رسالہ تصوف» و «مسائل شریعۃ» جیسے عالم و فاضل اس خاندان میں پیدا ہوتے رہے۔

راجستھان میں خواجہ معین الدین چشتی کی تشریف آوری کا زمانہ فارسی

---

۱ سلطان التارکین مصنفہ احسان الحق فاروقی مطبوعہ آفسیٹ پریس کراچی ۱۹۶۳ع ص ۷۰

۲ روداد کل راجستھان اردو سمینار جودھپور مرتبہ وحیداللہ خاں مطبوعہ دہلی پرنٹنگ پریس رام پور ۱۹۶۶ع ص ۱۱۵

زبان و ادب کے فروغ کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے آپ ۵۸۷ھ مطابق ۱۱۹۱ع میں اجمیر تشریف لائے تھے [1] آپ کو فارسی زبان پر قدرت کاملہ حاصل تھی۔ آپ نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے ملفوظات «انیس الارواح» کے نام سے مرتب کئے تھے اور خود آپ کے ملفوظات کا مجموعہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے «دلیل العارفین» کے نام سے مرتب کیا تھا ان کے علاوہ رسالہ «کشف الاسرار»، رسالہ «آفاق والنفس» بھی آپ ہی کی تالیفات میں شمار کئے جاتے ہیں نثر سے قطع نظر بحیثیت شاعر آپ کے ایک فارسی دیوان بعنوان «دیوان معین الدین چشتی قدس سرہ» مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۶۸ع کی بنا پر آپ کی شعرگوئی کی تصدیق بھی کی جاتی ہے۔ لیکن پروفیسر محمود شیرانی اس سے متفق نہیں وہ اس دیوان کو معین الدین کا ہروی کا بتاتے ہیں یہ ایک بحث طلب امر ہے اسلئے کہ جہاں ایک طرف پروفیسر شیرانی کو خواجہ صاحب کے شاعر ہونے میں شک و شبہ ہے وہیں دوسری جانب مذکورہ دیوان جس کی غزلوں میں معین اور معینی تخلص استعمال کیا گیا ہے، اس کے آخر میں مطبع کی جانب سے یہ عبارت بھی شائع کی گئی ہے کہ نواب مردان علی خاں بہادر رعنا دیوان سرکار مارواڑ کو خواجہ صاحب کے دیوان کا ایک نسخہ حاصل ہوا تھا جس پر ابوالفضل اور فیضی کی مہریں لگی ہوئی تھیں اس سے پتہ چلتا ہے یہ نسخہ شہنشاہ اکبر کے کتب خانے کی زینت بھی رہا ہے اسکے بارے میں نواب صاحب نے یہ روایت بیان کی ہے کہ ایک بار ۱۸۵۶ع میں انہوں نے خواجہ صاحب کو خواب میں دیکھا اُن سے عرض کیا کہ کوئی نقش تبرکاً مرحمت فرمایا جائے اس خواب کی تعبیر یہ ہوئی کہ کوئی شخص اُن کے گھر آکر مذکورہ نسخہ اُن کو فروخت کر گیا اسکے بعد دیوان کے مختلف ایڈیشن شائع ہوتے رہے

اس دیوان کے بارے میں پروفیسر شیرانی نے اپنے دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ کلام مولانا معین الدین ابن مولانا شرف الدین

---

۱ سوانح خواجہ معین الدین چشتی مصنفہ وحید احمد مسعود ص ۱۴۸

حاجی محمد الفراہی مصنف "معراج النبوۃ" کا ہے جو مولانا جامی کے ہمعصر تھے پروفیسر شیرانی کے نظریات کی تردید میں شمس الحسن شمس بریلوی نے اپنی تصنیف "لمعات خواجہ" مطبوعہ سنت پرنٹنگ پریس کراچی ۱۳۹۸ھ مطابق ۱۹۷۸ ع میں تفصیل بحث کی ہے۔ اس بحث پر روشنی ڈالتے ہوئے "راجستھان میں اردو زبان و ادب ۱۸۵۷ ع تک" میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی (عہد خلافت ۷۲۵ھ تا ۷۴۶ھ مطابق ۱۳۲۵ ع تا ۱۳۴۵ ع) کے ملفوظات کے مجموعے "خیر المجالس" کے حوالے سے آپ کے خلیفہ شاہ محب اللہ نے آپ کی مجالس کا ذکر "مفتاح العاشقین" میں کیا ہے جو ۱۳۵۶ ع کی تصنیف ہے۔ اُن ہی میں سے ایک مجلس میں خواجہ صاحب کی ایک غزل کا حوالہ بھی ملتا ہے جس کا مطلع ہے ـــ

از مطلع دل زد علم یک لمحه از رخسار او
شد ذره ذره هستیم در پردهٔ انوار او

اور غزل کا مقطعہ یہ ہے ـــ

مسکین معین در یک غزل برخواند اسرار ازل
بشنو کلام لم یزل در کسوت گفتار او

یہ غزل مذکورہ دیوان میں بھی موجود ہے اور اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ خواجہ صاحب میں شعر گوئی کی صلاحیت ہونا کوئی ناممکن بات نہیں تھی اس لئے کہ آپ جب ہندوستان میں تشریف لائے تھے اس وقت تک ایران و ترکستان میں فارسی شعر و سخن کو اتنی ترقی و مقبولیت حاصل ہوچکی تھی کہ محمود غزنوی کے زمانے میں فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر لافانی شہرت حاصل کرلی تھی اور فارسی شعر و سخن کا رواج عام ہوچکا تھا [1]

خواجہ صاحب کی تصنیف "انیس الارواح" اور دیوان کے علاوہ تذکرہ

---

۱ "راجستھان میں اردو زبان و ادب ۱۸۵۷ ع تک" مصنفہ ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی مطبوعہ آفسیٹ ثمر پریس دہلی ۱۹۹۲ ع ص ۱۷۸ تا ۱۸۵

«معین الارواح» (مشتمل بر حالات خواجہ معین الدین چشتی) مرتبہ نواب خادم حسین شاہ میں خواجہ صاحب کی تصانیف میں الہامات خواجہ، کشف الاسرار المعروف بہ معراج الانوار، رسالہ تصوف منظوم اور رسالہ آفاق والنفس کا ذکر کیا ہے۔[1] ان حقائق سے خواجہ صاحب کی فارسی زبان پر قدرت کے ساتھ آپکی علمی فضیلت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے رشد وہدایت کے لئے فارسی زبان سے یقیناً کام لیا ہوگا اور اسی کے ساتھ فارسی شاعری کو بھی وسیلہ بنایا ہوگا جیسا کہ آگے چل کر دکن میں صوفیائے کرام نے رشد وہدایت کے لئے دکنی شاعری کو اپنے خیالات کے اظہار کے لئے استعمال کیا تھا۔ بہرحال خواجہ معین الدین چشتی کی اجمیر میں تشریف آوری کے زمانے سے اس خطے میں فارسی زبان و ادب کے نقوش نظر آنے لگے تھے۔ آپ کے ہمراہ اور بھی صوفی اور درویش اس خطے میں آئے جن میں آپ کے مرید اور خلفاء بھی شامل تھے انہوں نے راجستھان کے مختلف خطوں میں پیغام حق پہنچایا اور فارسی زبان کو رشد وہدایت کا ذریعہ بنایا ایسے حضرات میں شیخ برہان الدین نے قصبہ ٹالہ (ریاست جے پور) میں، شیخ معین الدین نے قصبہ بیانہ (ریاست بھرت پور) میں اور آپ کے فرزند خواجہ فخر الدین نے سرواڑ (علاقہ اجمیر) میں اور شرف ابدال نے دھولپور میں سکونت اختیار کی تھی (خواجہ فخر الدین کے صاحبزادے خواجہ حسام الدین جگر سوختہ کا مزار قصبہ سانبھر ریاست جے پور میں ہے)۔ اسی سلسلہ میں خواجہ معین الدین چشتی کے خلیفہ سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوری متوفی ۶۷۷ھ مطابق ۱۲۷۸ ع کا اسم گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہے آپ صاحب تصنیف عالم بھی تھے اور صاحب دیوان شاعر بھی۔ آپ کی فارسی تصانیف میں «رسالۃ العشق»[2]

۱ تذکرہ معین الارواح مرتبہ نواب خادم حسن شاہ ناشر محی الاوقاف یعنی گدڑی شاہی کمیٹی جھالرہ اجمیر ص ۹۵ تا ۹۸

۲ رسالۃ العشق کا ایک قدیم نسخہ بعنوان رسالۂ عشقیہ مصنفہ سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوری، عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے «شامل کلکشن» میں موجود ہے جسکے اختتام پر «حبیب خدا قادر» ۱۱۴۹ھ کی مہر لگی ہوئی ہے۔

کے علاوہ رسالۃ السلوک، رسالۃ السمع، رسالہ اصول طریقت، رسالہ سوال و جواب، رسالہ چہار منزل اور آپ کے مکتوبات اور ملفوظات کے مجموعے نیز فارسی رباعیات کا ذکر احسان الحق فاروقی نے اپنی تصنیف "سلطان التارکین" میں کیا ہے [1] آپ کے ملفوظات کا مجموعہ "سرور الصدور" کے نام سے آپ کے پوتے حضرت خواجہ فرید الدین چاک پُراں نے مرتب کیا تھا۔ اس میں لکھا ہے کہ آپ "زبان ہندی شعر خوب می گفتند" [2] مگر آپ کے ہندی کلام کا کوئی نمونہ نہیں ملتا البتہ ایک غیر مستند روایت کے مطابق آپ اپنے گھر میں ہندی زبان استعمال کرتے تھے۔ اور وہ ہندی زبان غالباً وہی زبان ہوگی جو آگے چل کر اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔

خواجہ فرید الدین چاک پَراں کے خلیفہ مولانا ضیاء الدین نخشبی بدایونی کا نام آپ کی فارسی تصانیف طوطی نامہ، سلوک السلوک اور چہل ناموس وغیرہ کی وجہ سے غیر معروف ہیں اگرچہ آپ کا مستقل قیام بدایوں میں رہا مگر اپنے پیر و مرشد کی وجہ سے آپ اکثر و بیشتر ناگور آتے جاتے رہے۔

صوفی حمید الدین ناگوری کے اخلاف میں بہت سے صاحب تصنیف درویشوں اور صوفیوں کے نام ملتے ہیں آپ کے پوتے حضرت فرید الدین چاک پَراں کے صاحبزادے خواجہ حسین ناگوری مصنف "نور النبی" (تفسیر قرآن مجید) اور اُن کی اولاد میں شیخ محمد سعید مرتب رسالہ قاضی قطب کے علاوہ آگے چل کر شیخ نجم الدین پروانہ کا نام قابل ذکر ہے جنکی تصانیف میں مناقب الحبیب، مناقب التارکین اور راحت العاشقین وغیرہ شامل ہیں آپ کا مزار قصبہ جھنجھنوں (ریاست جے پور) میں مرجع خلائق ہے۔ [3] خواجہ نجم الدین پروانہ کے چھوٹے بھائی شیخ

---

۱ سلطان التارکین مصنفہ احسان الحق فاروقی ص ۱۴۳ تا ۲۹۸

۲ سلطان التارکین ص ۳۰۶

۳ خواجہ نجم الدین پروانہ اور اُن کے استاد محمد رمضان مصنف "آخر گت (آخرت نامہ)" ملک ناغ بی، عقائد عظیم اور نسخہ رنگیلی کا ذکر "راجستھان میں اردو زبان و ادب ۱۸۵۷ ع تک" میں کیا گیا ہے (ص ۸۳ تا ۸۸)

معز الدین معز بھی شاعری میں دخل رکھتے تھے۔[1]

راجستھان میں خواجہ معین الدین چشتی کے سلسلۂ چشتیہ کے علاوہ اور بھی بہت سے صوفی اور درویش آتے رہے جنکے مزارات جا بجا آج بھی مرجع خلائق ہیں جنہوں نے فارسی زبان کو رشد و ہدایت اور تبلیغ حق کا وسیلہ بنایا ہوگا اسلئے کہ خود اُن کی زبان فارسی تھی اور اس وقت تک نہ اردو زبان وجود میں آئی تھی اور نہ ہندی البتہ مقامی بولیاں رائج تھیں اُن کے سہارے درویشوں اور صوفیوں نے تبلیغ کی خدمت کس طرح انجام دی ہوگی یہ بات غور طلب ہے۔ اگر اسے اُن بزرگوں کی کرامات سمجھا جائے تو غلط نہوگا بہرحال ایسے تمام بزرگوں کا ذکر نہ ہمارا موضوع بحث ہے اور نہ اسکی یہاں گنجائش ہے البتہ اُن میں سے بطور مثال حضرت حاجب الحرم خواجہ شکربار کا حوالہ دینا غیر مناسب نہوگا جن کا مزار قصبہ نَربڑ مضافات جھنجھنوں میں ہے۔ اُن کے مزار کے سلسلے میں ایک روایت مشہور ہے کہ وہ مزار کسی ریت کے ٹیلے میں دبا ہوا تھا۔ وہاں بہلول لودی (۱۴۵۱ع تا ۱۴۴۹ع) نے یونس خاں باغی کی سربراہی میں سرکشوں کی سرکوبی کے لئے ایک فوج بھیجی تھی یونس خاں نے وہاں جاکر خواب میں خواجہ شکربار کو دیکھا انہوں نے یونس خاں کو بشارت دی تھی کہ ریت کے فلاں ٹیلے کے نیچے میرا مزار ہے اسکو پشت پر لیکر جنگ کرو تمہیں فتح حاصل ہوگی۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اسکے بعد سپہ سالار نے ٹیلے کو کھدوایا تو مذکورہ بزرگ کا مزار نکلا اور اس زمانے سے آج تک بڑی عقیدت کے ساتھ لوگ آپ کے مزار پر جاتے ہیں۔ فتح کے بعد بادشاہ کی جانب سے یونس خاں اور اسکے بعد اسی خاندان کے افراد وہاں کے انتظام کے لئے مامور ہوتے رہے اسی خطے میں قصبہ کھنڈیلہ (ضلع جھنجھنوں) کے قریب مہدویہ فرقہ کے ایک بزرگ میاں عبداللہ خلف و سجادہ نشیں میاں مصطفےٰ گجراتی نے ۹۹۹ ھ مطابق ۱۵۹۰ ع میں دائرہ آباد کیا تھا۔ یہ دائرہ آگے چل کر اس فرقہ کا ایک بہت بڑا مرکز بنگیا۔

بہرحال اِن حقائق سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ راجستھان میں جہاں

---

۱ سلطان التارکین ص ۲۹۷

ایک طرف صوفیوں اور درویشوں کی تعلیم و تلقین نے اس خطے میں فارسی زبان و ادب کے فروغ کو تقویت پہنچائی ہے وہاں دوسری جانب سلاطین دہلی کے دور حکومت میں فوجی مہمات اور سرگرمیوں کے ساتھ ہی ساتھ قصبات اور قلعہ جات پر مسلم حکمرانوں کے قبضے اور مسلم عاملوں اور حاکموں کے تقرر کے باعث راجستھان میں فارسی کی ترویج میں اضافہ ہوتا رہا۔ اسلئے کہ فوجی مہمات اور فتوحات کے باعث فارسی بولنے والے حضرات کی آمد و رفت کا سلسلہ اس خطے میں عرصۂ دراز تک جاری رہا اس سلسلہ میں مارواڑ کے «تماپیر» کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جن کا اصل نام حبیب اللہ تھا اور وہ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ حفیظ اللہ بیکس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ وہ سپہ سالار کی حیثیت سے ۱۲۹۹ع میں بعہد علاؤ الدین خلجی مارواڑ میں آئے تھے اور وہیں شہید ہوئے۔[1] اور فارسی میں تحریری احکامات، فرامین اور اسی نوعیت کی تحریرات فارسی کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہوتی رہیں۔

اس دور کی فوجی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اجمیر اور ناگور کے علاوہ منڈور، رنتھمبور اور چتوڑ کے قلعوں کی فتوحات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۱۳۵۵ع میں محمود خلجی کا اجمیر پر قبضہ ہوا۔ ۱۵۳۱ع میں اسپر سلاطین مالوہ نے فتح پائی ۱۵۵۶ع میں اکبر اعظم کے زیر نگیں آیا اجمیر کے حکمران خاندان کو راجستھان کے راجاؤں میں سربراہی حاصل تھی اور اجمیر کی فتح کو راجستھان پر قبضہ کا مترادف تصور کیا جاتا تھا چنانچہ ۱۰۰۸ع میں اجمیر پر محمود غزنوی کے حملے کے بعد ۵۸۸ھ مطابق ۱۱۹۲ع میں سلطان شہاب الدین غوری نے اجمیر کو فتح کیا اور قطب الدین ایبک نے علی محمد کو ناگور کا حاکم مامور کیا۔ اور سلطان شمس الدین التمش نے ۶۰۸ھ مطابق ۱۲۱۳ع میں وہاں ٹکسال قائم کی ناگور کی ٹکسال میں التمش کے عہد کے ڈھلے ہوئے سکوں کا حوالہ ملتا ہے اسکے بعد غیاث الدین بلبن نے بھی ناگور کو ٹکسال قائم رکھا۔

التمش نے ۱۲۲۵ع میں رنتھمبور کا قلعہ فتح کرنے کے بعد منڈور (مارواڑ)

۱　روداد جودھ پور سمپوزیم مرتبہ وحید اللہ خاں ص ۱۱۲

کا قلعہ فتح کیا اسی زمانے میں ایرانی شہزادے شمس الدین دندانی کو ناگور کا حاکم مقرر کیا گیا اسنے وہاں شمس تالاب اور شمس مسجد تعمیر کرائی۔ وہیں اس کا مزار بھی ہے۔ ناگور کو اس زمانے میں ایک صوبے کی حیثیت حاصل ہوچکی تھی اس پر یکے بعد دیگرے ملک کریم الدین، ملک معز الدین بلبن، ملک سیف الدین ایبک کاشلی خاں اور رکن الدین فیروز شاہ صوبے دار کی حیثیت سے قابض رہے۔ فیروز شاہ تغلق نے سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوری کی درگاہ کا بلند دروازہ تعمیر کرایا جسکے ایک ایک پتھر پر قرآن مجید کی آیات اور فارسی کی عبارات کندہ ہیں۔ سلاطین مغلیہ کا دور حکومت شروع ہونے سے قبل، ناگور، سلاطین گجرات کے زیر نگیں رہا۔

اجمیر اور ناگور کے علاوہ منڈور، رنتھمبور گاگرین اور چتوڑ کے قلعوں کے گرد سلاطین دہلی کی فوجیں منڈلاتی رہیں۔ چتوڑ سے متعلق ہمایوں کے عہد کا یہ واقعہ بیان کرنا یہاں غیر مناسب نہوگا کہ گجرات کے بادشاہ بہادر شاہ نے ۱۵۳۶ ع میں چتوڑ پر حملہ کیا وہاں کے راجہ بکرماجیت کی والدہ رانی کرناوتی نے ہمایوں سے مدد مانگی اور ایک راکھی بھیج کر اسے اپنا بھائی بنایا ہمایوں نے اسے قبول کرتے ہوئے بہادر شاہ کو لکھا ؎

اے کہ ہستی غنیم شہر چتوڑ
کافراں را چہ طور می گیری
بادشاہے رسید در سرِ تو
تو نشستہ چتوڑ می گیری

بہادر شاہ نے جواب دیا ؎

منم کہ ہستم غنیم شہر چتوڑ
کافراں را بحور می گیرم
ہر کہ بکند حمایت چتوڑ
تو بہ بیں کش چہ طور می گیرم

ہمایوں نے بہادر شاہ کی فوج پر حملہ کردیا اور وہ ہمایوں کی فوج کے سامنے قدم نہ جما سکا۔[۱] قطب الدین ایبک کے زمانے سے مغلوں کے عہد تک کسی نہ کسی بادشاہ کا کسی نہ کسی مقام پر قبضہ رہا اور وہاں مسلم حکام مامور ہوتے رہے۔ اور جا بجا مساجد، مقابر اور دیگر عمارات کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا۔ خواجہ صاحب کی درگاہ کا اجمیر میں سلطان محمود خلجی کا تعمیر کردہ بلند دروازہ، خواجہ صاحب کی درگاہ کے گنبد کی نقاشی، مزارات کے کتبات اور دیگر عمارات کے علاوہ بالخصوص عہد اکبری میں تعمیر شدہ اکبری مسجد، جہانگیر کے زمانے کا نور چشمہ اور شاہجہاں کی تعمیر کردہ شاہجہانی مسجد وغیرہ اجمیر پر اسلامی اقتدار کی شاہد ہیں۔ عہد اکبری میں ہی حسین قلی خان کی تعمیر کردہ ناگور کی اکبری مسجد، منوہر پور کی اکبری مسجد اور آمیر کی اکبری مسجد اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

اگرچہ راجستھان میں صوفیائے کرام کی آمد اور اسی کے ساتھ عہد سلاطین کی فوجی سرگرمیوں کے باعث فارسی زبان و ادب کی ترویج یہاں ہوتی رہی لیکن حقیقت یہ ہے سلطنت مغلیہ کے ہندوستان میں قیام اور بالخصوص اکبر اعظم کا عہد حکومت شروع ہونے کے بعد اس خطے میں فارسی زبان و ادب کو جس تیزی سے آگے بڑھانے کا موقع ملا اسی کا نتیجہ تھا کہ اس صوبے کی بہت سی دیسی ریاستوں کے درباروں اور دفتروں میں فارسی زبان استعمال کی جانے لگی۔ اور فارسی منشی، محرر اور حکام ریاستوں میں ملازم رکھے جانے لگے۔ فارسی کے راجستھان میں فروغ کو والیان ریاست کی اکبر اعظم کے ساتھ قرابتداری نے بالخصوص تقویت پہنچائی ۱۵۶۴ع میں آمیر کے راجہ بھارامل کی دختر کی اکبر اعظم کے ساتھ شادی ہوئی[۲] بقول سعید مارہروی وہ پہلی راجپوت خاتون تھی جس کو شاہان مغلیہ کی حرم سرا میں داخل ہونے کا فخر حاصل ہوا اکبر اعظم نے اسکو عارف النساء کے خطاب سے نوازا تھا۔ اس کا اصل نام تو شنبلی بائی یا جیا

۱ وقائع راجستان ص ۵۱ و ۵۲

۲ وقائع راجپوتانہ (جلد اول) مصنفہ جوالا سہائے ماتھر مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۷۸ع ص ۶۱۹

رانی بتایا جاتا ہے[1] مگر عام طور پر اسکو جودھا بائی کے نام سے جانا جاتا ہے جسکے بطن سے شہزادہ سلیم پیدا ہوا تھا اور جو اکبر کے بعد شہنشاہ جہانگیر کے نام سے ہندوستان کا بادشاہ بنا۔

اکبر اعظم کی دوسری شادی مارواڑ کے راجہ مالدیو کی دختر سے ہوئی تھی جسکو اکبر نے «راحت جاں» کا خطاب عطا کیا تھا۔[2] شہنشاہ جہانگیر نے تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ راجہ مان سنگھ (والی مارواڑ) کی پھوپھی (راجہ مالدیو کی دختر) میرے والد کے گھر میں تھی اور اسکی (راجہ مان سنگھ) کی بہن سے میں نے نکاح کیا تھا جسکے بطن سے شہزادہ پیدا ہوا تھا[3] جہانگیر نے خسرو کی والدہ کو شاہ بیگم کے خطاب سے نوازا تھا۔ جہانگیر نے دوسری شادی مہاراجہ اودے سنگھ کی دختر سے کی تھی اور اسکو «حیات النساء بیگم» کا خطاب دیا تھا۔[4] اس کے بطن سے شہزادہ خرم پیدا ہوا تھا۔[5] شہزادہ خرم جہانگیر کے بعد شاہجہاں کے نام سے تخت نشین ہوا۔ اس طرح راجپوت راجکماریوں کے کے بطن سے پیدا ہونے والے شہزادے ہندوستان کے تخت و تاج کے مالک بنتے رہے۔

شاہان مغلیہ اور والیان ریاست کے درمیان قرابتداری کا مسئلہ فرخ سیر کے زمانے تک جاری رہا فرخ سیر نے مہاراجہ اجیت سنگھ والی جودھپور کی دختر سے شادی کی تھی اسکو گیتی آرا بیگم کا خطاب دیا گیا تھا[6] اس قرابتداری اور شاہی اطاعت و خدمتگزاری کے باعث والیان ریاست اور اُن کے عزیز و اقارب اور ملازمین اپنی اپنی حیثیت کے مطابق شاہی مناصب و مراتب پر مامور ہوتے رہے اور اعلیٰ اعزازات و خطابات سے نوازے جاتے رہے چنانچہ مہاراجگان آمیر میں مہاراجہ مان سنگھ کو اکبر اعظم نے، مہاراجہ بھاؤ سنگھ کو جہانگیر نے اور مہاراجہ

۱　وقائع راجستان مصنفہ نجم الغنی مطبوعہ ۱۹۲۷ع (جلد اول) ص ۲۸۶
۲　وقائع راجپوتانہ (جلد دوم) ص ۵۸
۳　اردو ترجمہ تزک جہانگیری مترجم احمد علی سیماب مطبوعہ ۱۲۹۰ھ ص ۴۷
۵　وقائع راجستان (جلد دوم) ص ۱۹
۶　وقائع راجستان (جلد دوم) ص ۴۰

جے سنگھ اول کو شاہجہاں نے "مرزا راجہ" کے خطاب سے نوازا تھا۔ اسی طرح فرخ سیر نے مہاراجہ جے سنگھ (دوم) کو راجہ ادھیراج اور محمد شاہ نے ابھے سنگھ والی جودھ پور کو "راج راجیشر" کے خطابات عطا کئے تھے۔ خطابات کے علاوہ مہاراجگان کو پنج ہزاری اور ہفت ہزاری مناصب اور نقارہ و نشان بھی عطا کئے گئے صوبے دار بھی مقرر کئے گئے اور افواج شاہی کے سپہ سالار بنائے گئے بقول مرتب جائزہ زبان اردو (مولوی عبدالحق)

"مان سنگھ کے زمانے میں تو اعتبار و اقتدار کی انتہا نہ رہی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے صوبوں میں مان سنگھ نے صوبیداری کے فرائض انجام دئے۔ اسکو بادشاہ کی جانب سے کابل اور غزنی پر فوج کشی کے لئے بھیجا گیا۔[1]

اس قرابت داری اور مراسم کے ساتھ شاہی نوازشات نے باہمی تہذیب و تمدن، کلچر، فنون لطیفہ، نقاشی، مصوری، موسیقی اور رقص و سرود کے علاوہ زبان و ادب کو بھی متاثر کیا اسی ارتباط نے مغل اور راجپوت فن تعمیر کو جنم دیا۔ جسمیں ایک گنگا جمنی تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے اسکی شاید یہاں کی تاریخ کے ساتھ والیان ریاست کے شاہی محلات کی تعمیر، اُن کے در و بام کی نقاشی، باغات کی تزئین کاری ہے اسی طرح لباس و پوشاک اور زیورات کی ساخت کے ساتھ رقص و سرود سے متعلق مزامیر اور اُن کے اصطلاحی نام تہذیبی، ثقافتی اور ادبی اثرات کی گواہی دے رہی ہیں مغل راجپوت فن تعمیر کے نمونے یہاں کی داستانہائے پارینہ کی منہ بولتی تصویریں ہیں جنکے پردوں میں تہذیب و تمدن کی جھلکیاں، آداب معاشرت کی پرچھائیاں اور فنون لطیفہ کی رعنائیاں چھپی ہوئی ہیں محلات اور عمارات کی تعمیر کے ساتھ اُن کے نام اس خطے میں فارسی زبان کے الفاظ و محاورات کی مقبولیت کے رازدار ہیں۔ ایسے ناموں میں دیوان عام، دیوان خاص، تخت شاہی، شیش محل، ہوا محل، چندر محل وغیرہ آج بھی بدستور والیان ریاست کے محلات سے وابستہ ہیں۔ اسی طرح صدہا فارسی الفاظ و محاورات آہستہ آہستہ مقامی بولیوں میں اس طرح گھلتے ملتے رہے کہ وہ راجستھان کی مقامی بولیوں کا

---

۱ جائزہ زبان اردو مرتبہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی مطبوعہ ۱۹۴۰ع ص ۹

حصہ بنگئے. مثال کے طور پر لفظ «صاحب» کا مخفف «سا» آج بھی عام طور پر دیہات تک میں رائج ہے مثلاً بابا سا — کاکا سا — بائی سا وغیرہ. عام بول چال کے الفاظ کے علاوہ دفتری اصطلاحات اور محکمہ جات کی اگر فہرست مرتب کی جائے تو اسکے لئے ایک دفتر درکار ہوگا. محکمہ خاص، محکمہ عام، محکمہ گیرائی (پولیس)، محکمہ جاگیرات، محکمہ تعمیرات، محکمہ باغات، محکمہ آب پاشی، محکمہ دیوانی، محکمہ فوجداری، محکمہ بخشی خانہ، سلاح خانہ، توشہ خانہ، نظامت تحصیل وغیرہ وغیرہ ان محکموں کی نسبت سے اُن سے متعلق ملازمین کے نام بھی خالص فارسی ہیں. مثلاً دیوان، فوجدار، رسالدار، ناظم، تحصیلدار، منصرم گرداور وغیرہ، اسی دفتری اصطلاحات میں مدعی، مدعا علیہ، فیصلہ، جرح، بحث، تنقیحات وغیرہ کا رواج آج بھی نظر آتا ہے. کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سلاطین مغلیہ اور والیان ریاست کے خوشگوار تعلقات نے اس خطہ میں فارسی زبان کے فروغ کو تقویت پہنچائی.

راجستھان میں فارسی زبان و ادب اور شعر و سخن کے فروغ میں صوفیوں، درویشوں اور سپاہیوں کے علاوہ ایسے ارباب علم و ادب کے نام بھی سامنے آتے ہیں جنکو قدرت نے علم و ادب کے جوہر عطا کئے تھے. اور اسے حسن اتفاق کہا جاسکتا ہے کہ ایسے بعض حضرات اکبر اعظم کے زمانے میں ہی اس خطے میں پیدا ہوئے. اس سلسلہ میں سب سے نمایاں شخصیات فیضی اور ابوالفضل کے نام پیش کئے جاسکتے ہیں اُن کے دادا شیخ خضر یمنی ۹۱۱ ھ مطابق ۱۵۰۵ ع میں سیستان سے ناگور آکر سکونت پذیر ہوئے تھے. فارسی اُن کی مادری زبان تھی. ناگور ہی میں انہوں نے شادی کی تھی اور وہیں اُن کا ہونہار بیٹا شیخ مبارک ۹۱۸ ھ مطابق ۱۵۱۲ ع میں پیدا ہوا تھا.[۱] شیخ مبارک عربی اور فارسی کا زبردست عالم تھا اُس نے علامہ دُمیری کی شہرۂ آفاق عربی تصنیف «حیٰوۃ الحیوان» کا فارسی زبان میں ترجمہ کرنے کے علاوہ قرآن مجید کی تفسیر «منبع نفائس العلوم» کے نام سے کی تھی جو چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے.[۲]

---

۱ ابوالفضل علامی کی سوانح عمری، مصنفہ مولوی غلام الثقلین مطبوعہ مطبع خادم التعلیم لاہور ۱۸۹۳ع ص ۲

۲ بزم تیموریہ مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مطبع اعظم گڈھ. ۱۹۴۸ع ص ۶۳

اکبر اعظم کے نورتن اور فارسی کے جید عالم جنکی علمی و ادبی عظمت کو اہل ایران نے بھی تسلیم کیا تھا وہ شیخ مبارک ہی کے بیٹے تھے ان کے علاوہ شیخ ابو الخیر اور شیخ ابو البرکات بھی شیخ مبارک کے صاحبزادے تھے لیکن ان چاروں بھائیوں میں ابو الفضل اور فیضی کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ فیضی ناگور ہی میں پیدا ہوا تھا وہیں اسنے پرورش پائی تھی اور اپنے والد شیخ مبارک سے تعلیم حاصل کی تھی، بہت چھوٹی عمر میں اسکی علمی و ادبی شہرت اکبر اعظم کے دربار تک پہنچی اور صرف بیس سال کی عمر میں وہ اکبر کے دربار سے وابستہ ہوگیا وہ نہ صرف عربی، فارسی بلکہ سنسکرت زبان سے بھی بخوبی واقف تھا اور شعر گوئی پر اسکو قدرت حاصل تھی تیس سال کی عمر میں اسکو اکبر اعظم نے ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا تھا اسکی تصانیف کی تعداد تقریباً ایک سو بتائی جاتی ہے [1] ان میں چند کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں جن سے فیضی کی عالمانہ اور شاعرانہ عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

(۱)	سواطع الالہام	قرآن مجید کی بے نقط تفسیر فارسی زبان میں [2]
(۲)	شوارد الکلام	اخلاقیات پر بے نقط تفسیر
(۳)	فارسی ترجمہ لیلاوتی	فن ریاضی پر سنسکرت کی کتاب کا فارسی ترجمہ
(۴)	مثنوی شکوہ سلیمان و بلقیس	بجواب مثنوی خسرو و شیریں مصنفہ مولانا نظامی
(۵)	" نل و دمن	" " لیلی مجنوں " " "
(۶)	" ہفت کشور	" " ہفت پیکر " " "
(۷)	اکبر نامہ (نثر)	" " سکندر نامہ " " "
(۸)	دیوان فیضی	

فیضی کی عالمانہ شخصیت اور شاعرانہ فضیلت کا اعتراف ملا عبد القادر بدایونی جیسے مورخ نے کیا ہے جو بنیادی طور پر مذہبی اعتقادات کو پسند نہیں

۱ بزم تیموریہ مصنفہ صباح الدین عبد الرحمٰن ص ۸۰

۲ سواطع الالہام کا ایک نسخہ عربی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک میں محفوظ ہے

کرتا تھا۔[1]

فیضی کا چھوٹا بھائی ابوالفضل اگرچہ اس زمانہ میں آگرہ میں پیدا ہوا تھا جب اسکے والد شیخ مبارک کا وہاں قیام تھا۔ مگر اس کا بچپن بھی ناگور ہی میں گذرا وہیں اپنے والد سے اُس نے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ وہ بھی اپنے بھائی فیضی کی طرح زبردست عالم تھا۔ اس نے سترہ سال کی عمر میں آیۃ الکرسی کی فارسی زبان میں تفسیر لکھ کر اکبر کے دربار میں رسائی حاصل کی تھی اور ترقی کرکے وزارت عظمیٰ کے عہدے تک سرفرازی حاصل کی تھی، اسکی عالمانہ فضیلت کے باعث اُسے «علامی» کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اکبر نامہ، آئین اکبری، انشائے ابوالفضل، کشکول ابوالفضل اور جامع اللغات کے علاوہ رامائن کا فارسی ترجمہ اسکی علمیت کے شاہد ہیں

راجستھان کے قصبہ ٹوڈہ بھیم (ریاست جے پور) میں ملا عبدالقادر جیسا مورخ اور اسی ریاست کے قصبہ سانبھر میں منوہر داس توسنی پیدا ہوا تھا جسکو ہندوستان کا اولین غیر مسلم فارسی گو شاعر ہونے کا فخر حاصل ہے اسکے بارے میں مصنف «بزم تیموریہ» نے لکھا ہے کہ۔

«توسنی منوہر نام، سانبھر کے راجہ لُون کرن کا بیٹا تھا۔ اکبر نے اسکو مرزا منوہر کا خطاب دیا تھا مگر وہ خود کو محمد منوہر لکھتا تھا اسکی شاعری میں متانت و سنجیدگی تھی اس کا ایک شعر ہے

شیخ مُستغنی بدیں و برہمن مغرور کفر
مست حسن دوست را باکفر و ایماں کار نیست[2]

جہانگیر نے تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ وہ قوم کا کچھواہا راجپوت تھا۔[3]

١ بزم تیموریہ ص ٧٦
٢ بزم تیموریہ ص ١٠٧
٣۔ ریاست آمیر جو بعد میں ریاست جے پور کہلائی اس کا حکمراں خاندان کچھواہا راجپوتوں کا تھا جن سے اکبر اعظم نے قرابتداری قائم کی تھی (اس کا حوالہ اوپر کے صفحات میں دیا جاچکا ہے)

اکبر کی اس پر بڑی عنایت تھی اس کی فارسی زبان بھی سکھائی اور وہ اسمیں شعر بھی کہتا تھا یہ شعر اسی کا ہے ؎

عرض رخلقت سایہ ہمیں بود کہ کسے
بنور حضرت خورشید پائے خود نہ نہد[1]

منوہر داس توسنی کو فارسی کا اولین غیرمسلم شاعر تسلیم کرتے ہوئے منشی لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے تذکرۂ گل رعنا میں لکھا ہے کہ

"آغاز سخنوراں در قلمرو ہندوستان در عہد جلال الدین اکبر بادشاہ شدہ. دراں عصر از ہندی نسباں کسے کہ زبان را باسخن آشنا کرد رائے منوہر داس توسنی است"[2]

منوہر داس کے نام پر اکبر اعظم نے دہلی سے جے پور کی شاہراہ پر قصبہ منوہر پور آباد کیا اور منوہر داس کو وہاں کا رئیس بنایا تھا. شفیق نے توسنی کا یہ شعر بھی درج کیا ہے ؎

زاہدا کعبہ پرستی تو وما دوست پرست
تو بایں عقـــل مسلمانی وما برہمیم[3]

قصبہ منوہر پور جے پور دہلی شاہراہ پر جے پور سے تقریباً پچاس کلو میٹر کے فاصلے پر ہے اکبر نے آگرہ سے اجمیر جاتے ہوئے منوہر پور میں قیام کیا تھا. اس موقع پر ایک مسجد تعمیر کرائی گئی تھی جو اکبری مسجد کے نام سے اس دور کی آج بھی ایک یادگار موجود ہے[4]

---

۱ تزک جہانگیری مرتبہ سید احمد مطبوعہ علی گڈھ. ۱۸۶۴ع ص ۸

۲ تذکرہ گل رعنا مرتبہ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی مطبوعـــہ برقی پریس حیدر آباد (دکن) ۱۸۶۵ع ص ۳۹و ۴۱

۳و ۴ راقم الحروف کو ۱۹۵۸ع میں بحیثیت مدرس گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول منوہر پور کچھ دن قیام کا موقع ملا تھا. وہاں اکبری مسجد کے علاوہ اس زمانے کی کوئی اور یادگار نظر نہیں آتی البتہ منوہر داس کے بعد جب اسکے اخلاف نے قصبہ شاہپور کو اپنی ریاست کی راجدھانی بنایا تو وہاں فارسی داں ملازمین کی وجہ سے فارسی کے اثرات پہونچے. چنانچہ شاہپور کے حکمراں خاندان کے محلات میں فارسی دستاویزات اور شاہی فرامین کی موجودگی اس حقیقت کی شاہد ہے.

والیان ریاست آمیر سے قرابتداری کے باعث وہاں فارسی کا رواج اتنا بڑھا کہ مہاراجہ جے سنگھ اول (۱۶۲۲ء تا ۱۶۸۸ء) نے فارسی اور ترکی زبانیں بھی سیکھیں[1] اور اسکے پڑ پوتے مہاراجہ جے سنگھ دوم ۱۷۰۰ء تا ۱۷۴۳ء) نے جب ۱۷۲۸ء میں اپنے نام پر شہــــر جے پور آباد کیا اور اسے اپنی ریاست کی راجدھانی قرار دیا تو وہاں ایک رصدگاہ بھی تعمیر کرائی جسکو «جنتر منتر» کہا جاتا ہے اسکے بارے میں قآنی نے کہا ہے ــــ

تقــــویم مہ اولیٰ او پختــــہ موبت
چوں خط جداول برصد خانۂ جے سنگھ[2]

اس رصدگاہ کی تعمیر کے لئے مہاراجہ مذکور نے ہنــــدوستان کے جوتشیوں اور پنڈتوں کے علاوہ ایران اور پرتگال کے نجومیوں کو بھی بلایا تھا اور اس موقع پر فارسی زبان میں علم نجوم سے متعلق ایک کتاب بھی تصنیف کرائی تھی. اس کا نام «زیچ محمد شاہی» رکھا گیا اور اسے محمد شاہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا. یہ کتاب تین مقالات پر مشتمل ہے. مقالہ اول در معرفت سنین، مقالہ دوم در معرفت طالع بر وقت اور مقالہ سوم در معرفت سیارات و ثوابت.[3]

مہاراجہ جے سنگھ دوم علوم و فنون کا بڑا قدر دان تھا اسکے بارے میں شیو نرائن سکسینہ نے اپنی تصنیف «گلدستہ سرور» میں لکھا ہے کہ:

«اٹھارویں صدی عیسوی میں ہنــــدوستان میں طوائف الملوکی اور بد امنی پھیلی ہوئی تھی اور علم کا بازار سرد پڑ گیا تھا مگر مہاراجہ جے سنگھ کا دربار ایسا تھا جہاں ہر طرح کے پنڈت، عالم، ادیب اور شاعر عزت اور امن سے رہتے تھے.[4]

مہاراجہ مذکور کی علوم و فنــــون سے دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا احترام الدین شاغل نے تذکرۂ شعرائے جے پور میں لکھا کہ۔

---

۱ و ۲ جائزہ زبان اردو ص ۱۱

۳ زیچ محمد شاہی کا ایک نسخہ مہاراجہ جے پور کے سٹی پیلیس میوزیم کی زینت ہے.

۴ گلدستۂ سرور مصنفہ شیو نرائن سکسینہ مطبوعہ جیل پریس جے پور ۱۹۲۱ء ص ۱۲

« اُس رئیس کے ملکی و سیاسی کارناموں سے قطع نظـــر بعض علمی و ادبی کارناموں میں کتاب « کلپدرم » اور « جے سنگھ نوُگن » ، اس کا کتب خانہ اور اسکے خطوط بنام رؤسائے ہم عصر اسکے علم و فضل کی دلیل ہیں » [1]

خاں بہادر الطاف احمد خیری نے مہاراجہ جے سنگھ کے عہد کی فارسی تصانیف میں نسخہ نجوم اور منتہی الادراک کا ذکر اپنے ایک مقالہ میں کیا ہے ۔ [2]

مہاراجہ مذکور کے جس کتب خانہ کا ذکر مولانا شاغل نے تذکرۂ شعرائے جے پور میں کیا ہے وہ آج بھی « پوتھی خانہ » کے نام سے مہاراجہ جے پور کی ذاتی تحویل میں ہے وہاں کے بعض نادر و نایاب مخطوطات ، دستاویزات اور قلمی تصاویر کے ضائع ہوجانے کی بنا پر اُس پوتھی خانہ کا ذخیرہ دیکھنا بھی ممکن نہیں جسکہ اسمیں فارسی کی نایاب قلمی کتابیں ، شاہی فرامین اور تحریرات کے علاوہ قلعہ معلیٰ کی خبروں کا وہ ریکارڈ بھی ہے جو « اخبار معلیٰ » کے نام سے منسوب تھا ۔ اُن خبروں کی ترسیل کے لئے شاہی دربار میں خبر رساں مامور کئے جاتے تھے ۔ پوتھی خانہ کا یہ ذخیرہ جہاں ایک طرف فارسی تحریرات کا بیش بہا خزانہ ہے وہاں دوسری طرف سلاطین مغلیہ اور والیان ریاست جے پور کے مراسم کی یادگار اور اس زمانے کے سیاسی اور تاریخی حالات کا مآخذ بھی ہے ۔

جیسا کہ سطور بالا میں لکھا جاچکا ہے ریاست جودھ پور (مارواڑ) میں فارسی تصنیف و تالیف کا سلسلہ اسی زمانے سے شروع ہوگیا تھا جب قصبہ ناگور (ریاست جودھ پور۔مارواڑ) میں شیخ حمید الدین ناگوری تشریف لائے تھے جن کا ذکـــر پہلے کیا جاچکا ہے ۔ ریاست جودھ پور میں فارسی کے اس رواج کو ابوالفضل اور فیضی جیسے علماء نے تقویت پہنچائی اور وہاں کے غیر مسلم حضرات نے بھی اسکو آگے بڑھایا اس سلسلہ میں شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد کے منشی

---

۱ تذکرہ شعرائے جے پور مصنفہ مولانا احترام الدین شاغل مطبوعہ یونین پریس دہلی ۱۹۵۸ع ص ۲

۲ روداد کل راجستھان اردو کنونشن جے پور مرتبہ مولانا احترام الدین شاغل مطبوعہ ۱۹۶۳ع ص ۲۱

مادھو رام (پیدائش ۱۶۸۲ع وفات ۱۷۷۳ع) کا نام سر فہرست نظر آتا ہے۔[1] وہ ماروا‌ڑ میں ہی پیدا ہوا تھا۔ ۱۷۰۴ع میں مہاراجہ کی جانب سے اسکو شاہی خدمت کے لئے دہلی میں مامور کیا تھا جہاں وہ شہزادہ جہاندار شاہ اور نواب کوکلتاش کا میر منشی بھی رہا تھا ۱۷۴۲ع میں اسکو مہاراجہ جودھ پور نے دہلی سے واپس بلوایا تھا اسنے "انشائے مادھو رام" کے نام سے فارسی مکاتیب کا ایک ضخیم مجموعہ مرتب کیا تھا اس کتاب کو ہندوستان کی تاریخ ادبیات فارسی میں ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔[2] فارسی کے اعلیٰ درجات کے نصاب میں بھی یہ کتاب شامل رہی ہے

منشی مادھو رام کے ہم عصر محمد اکرام فیض (پیدائش ڈیڈوانہ۔مارواڑ ۱۱۱۲ھ مطابق ۱۷۰۹ع وفات قصبہ جھلائے تحصیل نوائی ضلع ٹونک ۱۱۹۱ھ مطابق ۱۷۷۶ع[3]) کا نام قابل ذکر ہے فیض ایک قادر الکلام شاعر اور صاحب تصنیف نثر نگار تھے۔ ان کی نثری تصانیف اور سنسکرت کی کتابوں کے فارسی تراجم کے علاوہ انکی چھ مثنویوں کا ایک مجموعہ "ریاض فیض" کے نام سے ۱۹۰۱ع میں اُن کے پوتے نے شائع کرایا تھا ان میں اعجاز فیض، آیات فیض، اشارات فیض، راز فیض اور قصۂ دولت کے علاوہ قصہ فیروز کے نام سے ایک مثنوی شامل ہے جس میں مہاراجگان جے پور و جودھ پور کے درمیان ۱۷۶۷ع کی ایک جنگ کا ذکر ہے۔ تذکرہ بہار سخن میں ان کا تفصیلی حال جودھ پور کے شعراء کے دور اول میں سر فہرست تحریر کیا ہے۔[4]

---

۱ "کایستھ سجن چرتر" مصنفہ منشی شیو نرائن سکسینہ مطبوعہ مطبع سراج الفیض جے پور ۱۹۱۴ع ص ۸۵

۲ "راجستھان میں اردو زبان و ادب کیلئے غیر مسلم حضرات کی خدمات" مصنفہ ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی ص ۴۲

۳ قصبہ جھلائے، تشکیل راجستھان سے قبل ریاست جے پور میں شامل تھا راقم الحروف نے وہاں کئی بار جاکر اکرام فیض کی قبر تلاش کرنے کی کوشش کی مگر کوئی نام و نشان نہیں ملا

۴ تذکرہ بہار سخن (تذکرہ شعرائے جودھ پور) مرتبہ شرف الدین یکتا جودھپوری مطبوعہ محبوب پریس حیدر آباد (سندھ) ۱۹۶۲ع ص ۹ تا ۱۷۔

اٹھارویں صدی کے ختم ہونے ہوتے دہلی اور آگرہ کے قرب و جوار کے علاقوں بالخصوص الور، بھرت پور اور جے پور وغیرہ میں اردو بولنے والے حضرات کی تعداد بڑھنے لگی تھی مگر ادبی اعتبار سے فارسی کو ہی شرف حاصل تھا جے پور کے مہاراجہ پرتاپ سنگھ (۱۷۷۸ء تا ۱۸۰۳ء) کے عہد حکومت میں حضرت مولانا ضیاء الدین دہلوی متوفی ۱۷۹۳ء جے پور میں آکر سکونت پذیر ہوئے آپ فارسی کے زبردست عالم تھے آپ کی تصانیف اور ملفوظات آپ کی درگاہ کے سجادہ نشین محمود میاں کے پاس محفوظ ہیں آپ کی درگاہ جے پور میں چہار دروازے کے باہر واقع ہے۔ آپ نے جے پور میں آکر اپنی خانقاہ پر درس و تدریس کا ایک مرکز بھی قائم کیا تھا جسکو شہر جے پور میں دینی تعلیم کا اولین مدرسہ کہا جاسکتا ہے آپ کے نام سے آج بھی ایک سرکاری پرائمری اسکول قائم ہے جو مدرسہ مولانا صاحب کے نام سے موسوم ہے آپ کی تعلیم و تلقین کا وسیلہ وہ اردو زبان تھی جو اُس زمانے میں تعمیری دور سے گزر رہی تھی

یہاں اردو زبان کے لسانی پہلو کی جانب اشارہ کرنا غیرمناسب نہوگا اسلئے کہ اردو کے مورخین اور ماہرین لسانیات نے عام طور پر اردو کی تعمیر و تشکیل کے سلسلے میں راجستھان کی مختلف بولیوں کے لسانی اثرات پر توجہ نہیں کی اور اگر توجہ کی بھی تو وہ راجستھانی بولی تک محدود رہی جبکہ راجستھانی کسی ایک بولی کا نام نہیں اسمیں بھرت پور کے خطے کی «برج بھاشا»[1] الور کے علاقے کی «میواتی»[2]، جے پور کی «ڈھونڈھاری»، جودھپور کی «مارواڑی»، اودے پور کی «میواڑی» اور کوٹہ بوندی جھالاواڑ کی «ہاڑوتی» بولیاں شامل ہیں اگرچہ پرتاپ گڈھ اور ڈونگرپور وغیرہ کی اپنی الگ بولیاں ہیں مگر اردو کے

---

۱ راجستھان کے مختلف اضلاع جو آگرہ اور متھرا کے قرب و جوار میں واقع ہیں اور جسمیں بھرت پور کے علاوہ ریاست دھولپور، ریاست قرولی اور ریاست جے پور کی نظامت سوائی مادھوپور (موجودہ ضلع) کے قصبات اور دیہات میں برج بھاشا کا رواج ہے اور یہی وجہ ہے کہ راجستھان میں «برج بھاشا» اکادمی قائم ہے۔

۲ ریاست الور کے بڑے حصے میں میواتی بولی کا چلن ہے اسلئے کہ وہ حصہ میواتیوں کا مسکن ہے۔

تعمیری و تشکیلی حصہ میں اُن بولیوں کے اثرات کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا جبکہ جے پور اور جودھ پور کی ریاستوں کی راجکماریوں کے بطن سے پیدا ہونے والے شہزادوں کی مادری زبان پر ان کی والداؤں کا اثر پڑنا ایک فطری بات تھی۔ اِن بولیوں کے الفاظ اردو میں تلاش کئے جاسکتے ہیں مثلاً "پوتڑہ"، "لیلہ" (لیمہ)، "ٹوکرہ" وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو راجستھانی بولیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اکبر اعظم، جہانگیر اور شاہجہاں کے درباروں اور فوجوں میں کثیر تعداد میں راجستھان کے راجپوت شامل رہے اور یہی وہ زمانہ تھا جب اردو زبان ایک بولی کی حیثیت سے نکھرنے لگی تھی شاہجہاں کے زمانے میں اسکو زبان اہل اردو اور پھر لشکری زبان کے نام سے بھی موسوم کیا گیا یہ اہل اردو یا لشکری کون تھے جن کے باہمی ارتباط نے اس نئی زبان کو مقبولیت عام عطا کی۔ اُن میں دوسری قوموں کے علاوہ راجپوت بھی شامل تھے ایسی صورت میں یقیناً راجپوتوں کی بولیوں نے بھی نئی زبان کو متاثر کیا ہوگا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ راجستھان میں اردو کے تعمیری دور کے زمانے سے بھی اسکے اثرات پہنچنے لگے تھے خود راجستھان کی مختلف بولیاں بھی اردو کی تعمیر و تشکیل میں اثر انداز ہوتی رہیں۔ اس سلسلہ میں بالخصوص برج بھاشا کے علاوہ میواتی کا نام پیش کیا جاسکتا ہے

میوات کا کچھ حصہ ریاست الور کے علاقہ میں شامل ہے۔ سلاطین دہلی کے دور حکومت میں وقتاً فوقتاً وہاں بادشاہوں کا تسلط بھی رہا ہے اس قوم کے اسلاف نے فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت (١٣٥١ء تا ١٣٨٨ء) کے دوران اسلام قبول کرلیا تھا اور اُن کو "خان جادو" کا خطاب عطا کیا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ خطاب "خان زادہ" بنکر اسم سبق بنگیا خانزادوں کا مرکز "تجارہ" تھا وہ لوگ نہ صرف وہاں برسر اقتدار رہے بلکہ ان میں اہل علم و فضل بھی پیدا ہوتے رہے خانزادوں میں حسن خاں میواتی نے بڑی شہرت و ناموری حاصل کی۔ یہ وہی حسن خاں تھا جو رانا سانگا کی حمایت میں پانی پت کے میدان میں بابر کی فوج سے مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا تھا۔ اسکی بیٹی اکبر اعظم کے معتمد بیرم خاں

سے منسوب تھی جسکے بطن سے اکبر اعظم کا سپہ سالار عبدالرحیم خان خاناں پیدا ہوا تھا جسکی شجاعت و سخاوت کے ساتھ اسکی شاعرانہ عظمت کی شاہد عہد اکبری کی تاریخ ہے۔ حسن خاں کے نام پر تجارہ کے قریب قصبہ حسن پورہ اور اسکے بھائیوں حسین خاں اور اسمٰعیل خاں کے نام پر حسین پورہ اور اسمٰعیل پورہ آباد ہوئے تھے۔[١]

حسن خاں میواتی کے والد کا ایک منظوم قول ایک طرف میو قوم کے کردار کی نشاندہی کرتا ہے اور دوسری جانب اس خطے میں اردو کی تعمیر و تشکیل کی نشاندہی کرتا ہے وہ قول یہ ہے ـــہ

کم سعی اور بے وفا بڑھ کر بولے بول
میوں پورا اُترے کسی بات سے قول[٢]

جاگیرداروں کے علاوہ تجارہ کے قاضی اور پرگنہ «کھیل» کے اہل سادات اور اس خطے میں پہنچنے والے صوفیوں اور درویشوں کی وجہ سے فارسی زبان کی ترویج ہوئی۔ تجارہ پہنچنے والے صوفیوں کا ذکر مختلف کتابوں میں ملتا ہے[٣]

اٹھارویں صدی عیسوی سے وہاں فارسی میں تصنیف و تالیف کا سراغ ملتا ہے اس سلسلہ میں قاضی سید عنایت اللہ (متوفی ١١٢٥ ھ/١٨١٣ ع) کی تصنیف «مسائل شریعہ» کا نام سب سے پہلے سامنے آتا ہے اسکے بعد وہاں نسب نامے لکھے گئے اُن میں «مراۃ الانساب» مرتبہ غلام محمد (تالیف ١٢٢١ ھ/١٨٠٦ ع) اور «مراۃ الانساب» مرتبہ میاں محمد یونس (تالیف ١٢٢١ ھ/١٨٠٦ ع) کے حوالے

---

١ و ٢ حیات کرم حسین ص ٢٧ و ٢٨

٣ اس سلسلہ میں تاریخ تجارہ بعنوان «ارژنگ تجارہ» مصنفہ منشی محمد مخدوم تھانوی مطبوعہ آگرہ اخبار پریس آگرہ ١٢٩٣ ھ مطابق ١٨٧٢ ع، «اذکار الابرار» اردو ترجمہ گلزار ابرار مترجم فضل احمد مطبوعہ ١٩٠٩ ع. «مرقع الور» مرتبہ منشی مخدوم تھانوی مطبوعہ آگرہ اخبار پریس آگرہ ١٨٧٦ ع اور «حیات کرم حسین» مصنفہ حکیم ظــل الرحمن مطبوعہ لیتھو کلر پرنٹرس علی گڈھ ١٩٨٣ ع وغیرہ کو دیکھا جاسکتا ہے۔

حیات کریم حسین میں ملتے ہیں۔ [۱]

اٹھارویں صدی میں ریاست آمیر اور ریاست بھرت پور کی سیاسی ابتری سے فائدہ اٹھا کر ریاست آمیر کے حکمراں خاندان کے ایک فرد پرتاپ سنگھ نے ان دونوں ریاستوں کے کچھ حصوں پر قبضہ کرکے ۱۷۷۵ ع میں اپنی الگ ریاست قائم کرلی تھی جسکی راجدھانی الور کو بنایا گیا تھا۔ شاہ عالم ثانی نے پرتاپ سنگھ کی حکومت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے راؤ راجہ کا خطاب اور شاہی منصب عطا کیا تھا۔ [۲] پرتاپ سنگھ کے دور حکومت میں مسلمانوں کو ریاست میں کلیدی حیثیت حاصل رہی ان میں ہوشدار خاں ، نبی بخش خاں اور الٰہی بخش خاں مہاراجہ الور کے دست راست اور ریاست کے مختار کار رہے [۳] اسی زمانے میں مرزا کابلی جیسا عالم بھی الور میں سکونت پذیر تھا۔ [۴]

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے جانشین مہاراجہ بختاور سنگھ (۱۷۹۱ع تا ۱۸۱۵ع) کے دور حکومت میں نواب احمد بخش خاں (فخر الدولہ دلاور جنگ خاں بہادر) بانی ریاست لوہارو مختار ریاست کے عہدے پر سرفراز رہے۔ گویا اٹھارویں صدی کے اختتام تک ریاست الور میں اردو کے فروغ کی راہیں ہموار ہوچکی تھیں۔

الور کے مہاراجہ بختاور سنگھ کے ہم عصر ریاست جے پور کے مہاراجہ پرتاپ سنگھ (۱۷۷۸ع تا ۱۸۰۴ع) کے عہد حکومت میں فارسی کے ساتھ اردو کے فروغ کے دھندلکے بھی نظر آنے لگے تھے مہاراجہ مذکور کی ایما پر منشی کالی رام کایستھ اجمیری نے فارسی زبان میں قدیم دستاویزات اور مستند تواریخ کی مدد سے ۱۷۹۴ع میں « نسب الانساب » مرتب کی تھی [۵] جو نہ صرف والیان جے پور

۱ حیات کرم حسین ص ۳۳ و ۳۴
۲ وقائع راجپوتانہ (جلد دوم) ص ۳۴۱
۳ وقائع راجستان (جلد اول) ص ۳۶۴
۴ حیات کرم حسین ص ۱۴۹
۵ نسب الانساب کا ایک قلمی نسخہ عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک میں محفوظ ہے اور اس کا کوئی دوسرا نسخہ کسی جگہ بھی دستیاب نہیں ہے۔

کا نسب نامہ بلکہ ایک تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ ہندی کا شاعر تھا اور "برج ندھی" کے نام سے شعر کہتا تھا۔ اس کے کلام کا مجموعہ "برج ندھی گرنتھاؤلی" کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔[1] ہندی کے علاوہ وہ فارسی آمیز زبان میں "ریختہ" بھی لکھتا تھا اور "ریختہ" سے مراد اردو زبان نہیں بلکہ وہ صنف سخن تھی جسمیں فارسی آمیز زبان استعمال کی گئی تھی اور رسم الخط دیوناگری تھا۔ اسکے ریختے جو "برج ندھی گرنتھاؤلی" میں شامل ہیں اسمیں عروض اور فن سخن سے قطع نظر اشعار کی زبان اس امر کی شاہد ہے کہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانے سے جے پور میں اردو شاعری کے دھندلکے نظر آنے لگے تھے مثال کے طور پر اس کے حسب ذیل ریختے غور طلب ہیں ؂

بیمار ہو رہا تھا بے جان بے حواب
تیر نگہ سے مجھ پر برسا حیات آب
زخمی جلائے جاوں پھر کیوں نہ لوں ثواب
برج ندھی ہین کی خاطر ہوا جگر خراب[2]

اٹھارویں صدی کے دوران ہی ریاست الور کے قیام سے کچھ پہلے آگرہ کے قریب ۱۷۲۳ع میں ریاست بھرت پور قائم ہوچکی تھی۔ اس کا جغرافیائی محل وقوع بڑی اہمیت کا حامل ہے بھرت پور اور آگرہ کے درمیان فتح پور سیکری آباد ہے جسکو اکبر اعظم کے زمانے میں ایک نمایاں تاریخی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کے علاوہ ریاست بھرت پور کے بعض مواضعات اور قصبات بھی اپنی تاریخی اہمیت کے حامل رہے ہیں اُن میں قصبہ بیانہ اور پہرسر وغیرہ ایسے مقامات ہیں جہاں ریاست کے قیام سے پہلے شاہی عملداری تھی اسکی وجہ سے فارسی اور اردو داں حضرات کی آمد و رفت اور قیام پذیری کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا ایسے قصبات کی قدیم عمارتیں، مساجد اور مقابر آج بھی اپنی تاریخ پارینہ کی داستانیں سنا رہی ہیں۔ قیام ریاست کے بعد وہاں کے اولین حکمراں راجہ سورج مل جاٹ

---

۱ برج ندھی گرنتھاؤلی مرتبہ پنڈت پری نرائن شرما مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۳ع
۲ برج ندھی گرنتھاؤلی ص ۲۴۰

کے عہد حکومت (۱۷۳۳ع تا ۱۷۶۳ع) کے دوران ریاست مذکور کے قصبہ « بیانہ » میں فرقۂ مہدویہ کے ایک بزرگ محمد جی میاں غریب نے اپنے فرقہ کے عقائد و نظریات، شرعی مسائل، اسلامی تاریخ، حیات طیبہ اور سیرت پاک کے علاوہ انبیائے کرام، خلفائے راشدین اور مہدویہ فرقہ کے بزرگوں کے ذکر پر مشتمل ایک ضخیم کتاب مثنوی کی صورت میں « تاریخ غریبی » کے نام سے اردو میں تصنیف کی۔ اس کی تصنیف کا آغاز ۱۷۴۷ ع میں کیا گیا تھا اور ۱۷۵۲ ع میں یہ مکمل ہوئی تھی کتاب کے آغاز میں حمد، نعت اور بزرگان دین کی منقبت لکھنے کے بعد تصنیف کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ ؎

سو عاجزی کرے بچارا — اس کتاب کا جوڑن ہارا
پڑھے سب کوئی نفع نصیبی — نادر کہا تاریخ تاریخ غریبی
گیارہ سے چونسٹھ ماہی — کئے شروع فضل الٰہی

گویا ۱۱۶۴ھ مطابق ۱۷۴۷ ع آغاز تصنیف کا سال ہے ۸۲۸ صفحات پر مشتمل « تاریخ غریبی » میں تقریباً دس ہزار اشعار ہیں۔ اشعار میں جابجا مصنف نے اپنا تخلص « غریب » استعمال کیا ہے اسکے بارے میں سب سے پہلے پروفیسر محمود خان شیرانی نے اپنے ایک مقالہ میں نشاندہی کی تھی جو اورینٹل کالج لاہور کے میگزین میں شائع ہوا تھا۔ اور اُن کے مقالات کی جلد دوم میں شامل ہے۔ پروفیسر شیرانی نے تاریخ عربی کے جس نسخہ کی روشنی میں اپنا مقالہ مرتب کیا تھا اس میں مصنف کا پورا نام اور مقام تصنیف کا حوالہ نہونے کی وجہ سے اس کا ذکر نہیں کیا اسکی ایک نقل بعد میں دستیاب ہوئی جو عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک میں موجود ہے اسکے اختتام پر حسب ذیل عبارت درج ہے:

« تمت تمام شد تاریخ غریبی من تصنیف محمد جی میاں ولد شیخ مجتبیٰ کاتب الحروف حقیر میران جی میاں بن سید عبداللہ ساکن نوانہ[1] بتاریخ شہر جمادی الاول ۱۲۶۷ھ » (مطابق ۱۸۵۰ ع)

---

۱ قصبہ نوانہ جے پور کی تحصیل چوموں کے قریب آباد ہے جہاں فرقہ مہدویہ کے معتقدین سکونت پذیر رہے تھے۔

مذکورہ عبارت سے کتاب کے مصنف محمد حی میاں کے نام کا پتہ چلتا ہے۔ اسکے بعد تاریخ غریبی کا ایک اور نسخہ ملا اور بالآخر کافی تحقیق و تلاش کے بعد یہ بات واضح ہوسکی کہ یہ تاریخ قصبہ بیانہ میں لکھی گئی تھی۔ [1] اور اسکو راجستھان کی اولین اردو تصنیف کہا جاسکتا ہے اسلئے کہ مذکورہ کتاب کے سن تصنیف (۱۱۶۴ھ/۱۷۴۷ع تا ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۲ع) سے پہلے ریاست بھرت پور کا قیام عمل میں آچکا تھا اور قصبہ بیانہ اسی ریاست میں شامل تھا کتاب کی تصنیف کے بعد اس کا مصنف بیانہ سے ترک سکونت کر کے قصبہ دائرہ شیخاواٹی ریاست جے پور میں سکونت پذیر ہوا جو فرقہ مہدویہ کا ایک بڑا مرکز تھا بہرحال ادبی اور فنی خامیوں اور غلطیوں کے باوجود "تاریخ غریبی" کی لسانی اہمیت مسلم ہے۔ اور ابتک کی تحقیق و تلاش کی روشنی میں یہ کتاب راجستھان میں اردو تصنیف و تالیف کے آغاز کی نشاندہی کرتی ہے اسی بنا پر "راجستھان میں اردو زبان و ادب ۱۸۵۷ع تک" میں تاریخ غریبی کو "راجستھان کی قدیم ترین اردو تصنیف" کہا گیا ہے اور اسمیں کتاب کے مقام تصنیف کی تحقیق سے قبل تک معلومات پر بحث کی گئی ہے [2]

ریاست بھرت پور کے قیام کے بعد دہلی کے بگڑتے ہوئے حالات کے دوران وہاں سے ترک وطن کرنے والے چند حضرات نے بھرت پور میں بھی قیام کیا اُن میں میر تقی میر اور میر حسن جیسے مامور شعراء کے نام قابل ذکر ہیں۔ میر تقی میر راجہ سورج مل جاٹ والی ریاست بھرت پور کے عہد حکومت (۱۷۴۳ع تا ۱۷۶۴ع) کے دوران اپنے صاحبزادے میر فیض علی کے ہمراہ وہاں پہنچے تھے

۱ اسی زمانے میں ایک اور منظوم رسالہ "آخرت نامہ" کے عنوان سے بھی غالباً ۱۷۶۹ع میں لکھا گیا تھا جس کا موضوع مسائل شریعہ ہے اور زبان "تاریخ غریبی" سے مشابہ ہے مگر اسکے مصنف اور مقام تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ غالباً مہدویہ فرقہ کے کسی بزرگ کی تصنیف ہے ممکن ہے وہ محمد حی میاں غریب ہوں۔ اسکی ایک نقل مقولہ ۱۸۸۳ع عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک میں ہے۔

۲ "راجستھان میں اردو زبان و ادب ۱۸۵۷ع تک" مصنفہ ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی مطبوعہ ۱۹۹۲ع ص ۵۱ تا ۱۳۔

اور مہاراجہ سورج مل نے اُن کی پذیرائی کی تھی۔[1] «ذکر میر» میں بھی اس کا حوالہ ملتا ہے۔[2]

اسی طرح میر حسن نے بھی دہلی سے لکھنؤ جاتے وقت بھرت پور کے قلعہ ڈیگ میں قیام کیا تھا جس کا ذکر انہوں نے اپنی مثنوی «گلزار ارم» میں اس طرح کیا ہے ؎

رہا میں ڈیگ میں آکر کئی ماہ
چلا واں سے رضائے حق کے ہمراہ[3]

ان حقائق سے یہ تو واضح ہوجاتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے دوران بھرت پور میں ارباب علم و ادب کی آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہوچکا تھا مگر اس وقت فارسی کے علاوہ اردو شعر و ادب کے آغاز کا سراغ نہیں ملتا یہی صورت حال دوسری ریاستوں میں نظر آتی ہے جہاں انیسویں صدی کے دوران اردو شعر و ادب کی ترویج و اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان میں ریاست ٹونک، کوٹہ، جھالاواڑ، بوندی، دھولپور، بیکانیر، جودھپور، اودے پور، قرولی اور کشن گڈھ وغیرہ کے نام شامل ہیں ان میں سے ریاست ٹونک، جھالاواڑ اور قرولی کا قیام انہی دنوں عمل میں آیا تھا۔ یہ ریاستیں انیسویں صدی میں قائم ہوئی تھیں اِن ریاستوں کے علاوہ اس خطے میں اجمیر کو ایک انفرادی حیثیت حاصل تھی اسلئے کہ ریاستوں کے حکمرانوں کی حیثیت ایسٹ انڈیا کمپنی سے معاہدوں کی بنا پر انگریزی حکومت کی سرپرستی میں رہتے ہوئے خود مختارانہ تھی جبکہ اجمیر پر براہ راست ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار قائم تھا۔ اگرچہ وہاں جہانگیر کے عہد میں اردو کے ایک شاعر شیخ دانیال متوفی ۱۳۰۲ھ/۱۵۸۵ع کے حسب ذیل شعر کا حوالہ دیا جاتا ہے ؎

جُگ جُگ جیویں حضرت خواجے

---

۱ اردو ترجمہ تاریخ ادب اردو مصنفہ رام بابو سکسینہ مترجم مرزا عسکری مطبوعہ نولکشور پریس ۱۹۵۲ع ص ۱۳۸۔

۲ «ذکر میر» مرتبہ مولوی عبد الحق مطبوعہ انجمن اردو پریس اورنگ آباد ۱۹۵۶ع ص ۹۰۔

۳ مثنوی گلزار ارم مصنفہ میر حسن مطبوعہ ۱۱۹۲ھ/۱۸۷۸ع۔

حضرت نبی رسول نواجے [1]

شیخ دایال کی شعر گوئی کے علاوہ اجمیر میں خواجہ صاحب کی شان میں عقیدتاً گائے جانے والے منظوم کلام میں بھی مقامی بولی کے ساتھ اردو الفاظ کی جھلک نظر آتی ہے ایسے منظوم کلام کو «کڑکا» کہا جاتا ہے جسکو صدیوں سے قوال نسلاً بعد نسلاً گاتے رہے ہیں اور آج بھی اس کا رواج ہے مثال کے طور پر ایک «کڑکے» کا یہ بند لسانی اعتبار سے غور طلب ہے ـــــ

تم بڑے سلطان حضرت چشتی	بڑے تخت اور ملک تم کو ہی چھاجا
روڑا مٹھو پر اپنا رحم کیجے	دل کا درد غور کرو خواجہ خواجہ

دین کے محتسب معین الدین خواجہ

ان اشعار میں «روڑا مٹھو» غالباً شاعر کا نام ہے جسکے لئے یہ روایت مشہور ہے کہ وہ جہانگیر کے عہد سے تعلق رکھتا تھا. اس قسم کے کلام سے اردو زبان کے تشکیلی دور میں اجمیر میں اسکے رواج کا سراغ تو ملتا ہے جو غیر مستند کہا جاسکتا ہے مگر ادبی اعتبار سے اردو کی ترویج و اشاعت اور شعر و سخن کے فروغ پر اس سے روشنی نہیں پڑتی اسلئے کہ راجستھان کے دوسرے خطوں کی طرح اجمیر میں بھی اردو شعر و ادب کے آغاز و ارتقاء کا سلسلہ انیسویں صدی میں شروع ہوا تھا گویا راجستھان میں اٹھارویں صدی عیسوی کے اختتام تک بول چال کی زبان کی حیثیت سے اردو کا چلن ہوچکا تھا جو اس خطے کے بڑے شہروں اور مخصوص قصبات تک محدود تھا مگر فارسی کی ادبی عظمت چھائی ہوئی تھی اسکو نہ صرف ریاستوں کے درباروں اور سرکاری امور کے دفتروں میں استعمال کیا جاتا تھا بلکہ تصنیف و تالیف کی زبان بھی فارسی ہی تھی فارسی کے اس رواج نے راجستھان میں اردو کے فروغ کے لئے ایک زمین ہموار کردی تھی چنانچہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقبال کا سورج طلوع ہونے لگا اور راجستھان کی دیسی خود مختار ریاستوں کے حکمرانوں نے سیاسی مصالح کی بنا پر انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے سے انگریزوں کے ساتھ معاہدے کرنے شروع کئے تو مختلف ریاستوں میں ملازمت کی غرض سے ارباب علم و ادب پہنچنے لگے اور اردو شعر و ادب کی ترویج کیلئے راہیں کھلنے لگیں.

● ● ●

[1] روداد کل راجستھان اردو سمپوزیم جودھپور ص ۱۵۲ .

عادل شاہی دور کا ادب
(۱۴۹۰ع تا ۱۶۸۶ع)

از

پروفیسر قیوم صادق، شعبۂ اردو، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

بیجاپور دکن کی اس مشہور سلطنت کا نام ہے جو سولھویں اور سترھویں صدی میں ایک وسیع حصے پر چھائی ہوئی تھی اور اس کے حکمراں عادل شاہ کہلاتے تھے اگرچہ اس سلطنت کو ختم ہوئے تین سو سال سے زائد ہوتے ہیں لیکن مغربی دکن کے در و دیوار سے ابھی تک اس کی عظمت ٹپکتی ہے اور دکن کے تمدن اور معاشرت میں اسکے گہرے نقوش پائے جاتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ اس مرحوم سلطنت کی شمیم انگیزیاں کب تک اہل دکن کے دل و دماغ کو معطر کریں گی۔ جس زمانے میں اس سلطنت کا سکہ رواں تھا۔ مغربی دکن میں پاکیزہ تمدن اور معاشرت کی نہریں بہتی تھیں۔ علم و فن کے چشمے اُبلتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سلطنت ایسی سرزمین میں قائم ہوئی تھی جہاں اہل کرناٹک کے تاریخی خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ کیونکہ دکن میں کرناٹک ہی ایسی سرزمین ہے جس نے پہلے دکن کی تمدنی خدمت کی اور اس کو سیاست کا سبق سکھایا۔ اسی سرزمین میں سب سے پہلے آندھرا کے راجگان نے اپنی راجدھانی قائم کی چالوکیہ اور راشٹر کوٹ کے راجگان بھی اسی سرزمین سے اُٹھے اور تمام دکن پر راج کیا۔ لیکن ابھی اس سرزمین کی تمدنی خدمت باقی تھی جو بہمنیوں اور عادل شاہیوں نے انجام دی۔

عادل شاہی حکمراں بہمنی سلاطین کے خوشہ چیں تھے۔ بہمنی سلاطین نے دکن کے نظام سلطنت کے لئے جو اصول وضع کئے عادل شاہیوں نے کرناٹک میں ان کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ بہمنیوں کے سامنے دکن کا لامحدود علاقہ تھا۔ جس طرح وہ تلنگانہ میں اپنا تمدنی اثر پھیلا رہے تھے اُسی طرح کرناٹک میں بھی اُن کا اثر پھیل رہا تھا اور ہر خطہ ان کے سرمایہ سے فیض یاب تھا لیکن عادل شاہیوں نے صرف کرناٹک کو اپنا گھر بنایا اور اسی کی آبیاری میں اپنی قوتیں صرف کیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کام چالوکیہ اور راشٹرکوٹ کے راجاؤں نے ادھورا

چھوڑ دیا تھا ان کو عادل شاہی سلاطین نے پورا کیا۔ چنانچہ گجرات کی جنوبی سرحدوں سے لیکر جہاں سے یہ سلطنت شروع ہوتی تھی، تنجور اور جنجی تک آج عادل شاہی تمدن کے تمدنی جواہر بکھرے پڑے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سلاطین نے اس سرزمین کو اپنا جنم بھوم سمجھا اور اس کی دل سے خدمت کی اس ملک کی تمدنی تعمیر میں ان کا حصہ اتنا ہی قابل قدر ہے جتنا خود اہل کرناٹک کا ہے اور اسی طرح چالوکیہ اور راشٹر کوٹ کے راجاؤں کے حصے کو بھی بھلایا نہیں جاسکتا

دکن کے اُس سیاسی انتشار میں اس سلطنت کی بنیاد پڑی تھی جو پندرھویں صدی کے آخری ایام میں رونما ہوا بہمنی سلطنت کا زوال اس سلطنت کا آغاز ہے کیونکہ جب بہمنی سلطنت کی کمزوری سے اسکی طنابیں ڈھیلی پڑنے لگیں تو اس کے دور دراز کے صوبہ دار جو طرفدار اور سرلشکر کہلاتے تھے مرکزی سلطنت سے روگرداں ہوگئے اور اپنا لوہا منوانے لگے اور اس زوال کا اصلی باعث دکن کی طبقہ واری کشمکش تھی جو گھن کی طرح لگ گئی اور بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ ان طبقوں کے رہنما جو ایک دوسرے کے رقیب تھے اپنی طاقت بڑھانے لگے اور جہاں موقع ملا خود مختار ہوگئے۔ یوسف عادل خاں سوائی جو صوبہ بیجاپور کا صوبہ دار تھا۔ اور اس عادل شاہی سلطنت کا بانی ہے۔ ایک طبقے کا رہنما تھا۔ یہ طبقہ محمود گاواں کے مرنے کے بعد یوسف کے گرد جمع ہوگیا اور اہل ملک کو نیچا دکھانا چاہتا تھا یوسف عادل خاں نے جو بعد میں یوسف عادل شاہ کے نام سے مشہور ہوا مرکزی سلطنت سے ہٹ کر بیجاپور میں ۸۹۵ھ مطابق ۱۴۹۰ع میں اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا اور ایک بہت بڑی عادل شاہی سلطنت قائم کردی۔ اگرچہ دکن کے بہت شکن حالات میں اس سلطنت کی بنیاد پڑی تھی لیکن آگے چل کر اس سلطنت کے تاجداروں نے کچھ ایسا خوشگوار طریق کار اختیار کیا کہ لوگ پندرھویں صدی کے برے حالات بھول گئے اور اس کے خوش آئند زمانہ کی تعریف کے گانے گانے لگے

اگر عادل شاہی سلطنت کی اصلیت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ

حقیقت میں بہمنی سلطنت کا ایک مغربی صوبہ تھا جب یہ سلطنت قائم ہوئی تھی، تو اس کے دستور سازوں نے جن میں بانی سلطنت علاؤ الدین حسن اور اسکا بیٹا محمد شاہ اول اور اُن کا مشہور وزیر سیف الدین غوری شامل ہیں۔ اس سلطنت کو چار صوبوں میں تقسیم کیا تھا اور یہ تقسیم بڑی حد تک جغرافیائی تھی کرناٹک اس کا مغربی صوبہ تھا۔ جس کا صدر مقام پہلے دلگام تھا جہاں خود محمود گاواں صوبہ داری کرتا تھا لیکن اس کے قتل کے بعد یوسف عادل خاں نے جو اپنے آپ کو مرحوم کا بیٹا سمجھتا تھا اس صوبہ پر قبضہ کرلیا اور یہیں اپنی خود مختار سلطنت قائم کی اور بجائے دلگام کے بیجاپور کو اپنا صدر مقام بنایا اس کے جانشینوں کے زمانے میں یہ ہندوستان کا ایک بڑا شہر بن گیا اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی کے جنوب میں کچھ فاصلہ پر قدیم چالوکیہ سلطنت کا مرکز بھی تھا۔

ابراہیم زبیری کے بیان سے جو بیجاپور کا مشہور مورخ ہے عادل شاہی سلطنت کی وسعت کا اندازہ ہوسکتا ہے اس کے الفاظ ہیں :

«زبان قدیمی این کنڑی است.... .... ولایت است فراخ و وسیع . »

اس کے جنوب میں بدنور مشرق میں حیدر آباد شمال میں گجرات اور مغرب میں سمندر واقع ہے اسی مورخ کے بیان کے مطابق اس سلطنت میں اٹھارہ ضلعے اور دو سو اکاسی (۲۸۱) تعلقے تھے . جب شہنشاہ عالمگیر نے اس پر قبضہ کرلیا تو اس سلطنت کی جملہ آمدنی ساٹھ کروڑ چوراسی لاکھ اکسٹھ ہزار آٹھ سو ستر روپئے ڈیڑھ آنہ تھی۔

ان اضلاع اور پرگنوں کے علاوہ اس سلطنت کی متعدد بندرگاہیں بھی تھیں جن سے محصول کے ذریعے خاطر خواہ آمدنی ہوجاتی تھی۔

شاہان عادل شاہی .

بادشاہ کی ادنیٰ سی حرکت بھی ہمہ گیر اثر رکھتی ہے . عوام و خواص اس کی رفتار و گفتار ، نقل و حرکت کی تقلید کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں . جس

چہرے سے بادشاہ کو دلچسپی ہوتی ہے۔ عوام الناس کا اس میں دلچسپی لینا یقینی ہے رعایا اس کے ذوق و شوق کا آئینہ ہوتی ہے ہم یہاں بیجاپور کے ان حکمرانوں کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنی شاہانہ سرپرستیوں سے دکن میں علم کے دریا بہا دیئے بلکہ خود بھی علم و ہنر کے شائق اور شعر و سخن کے دلدادہ تھے

یوسف عادل شاہ :

فارسی کا بلند پایہ شاعر تھا اس کو فن موسیقی سے بھی دلچسپی تھی، دور دور سے علماء و فضلاء کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دیتا اور اُن کو قیمتی تحائف ارسال کرتا تھا۔ مشہور مورخ فرشتہ نے اس کی علم دوستی اور علماء پروری کی بڑی تعریف کی ہے۔

اسمٰعیل عادل شاہ۔

بادشاہ کا تخلص وفائی تھا اور سچ یہ ہے کہ دکن کے کسی بادشاہ نے اسمٰعیل عادل شاہ کے سے لطیف اور متین اشعار نظم نہیں کئے۔

ابراہیم عادل شاہ اول :

وہ فنون لطیفہ سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کو موسیقی میں خاص مہارت حاصل تھی۔ وہ ایک علم دوست فرماں روا تھا۔ اس کی علم پروری کے باعث اس کے دربار میں ارباب علم و فضل کا ہمیشہ مجمع رہا کرتا تھا۔

ابراہیم کے عہد میں عراق و عجم کے بہت سے اہل علم و فضل حضرات نے بیجاپور میں سکونت اختیار کرلی اور بیجاپور کو ایران کا نمونہ بنا دیا

ابراہیم کی تخت نشینی کے بعد سے بیجاپور میں اُردو کی نشو و نما ہونے لگی اور فارسی کے بدلے شاہی دفاتر میں اُردو زبان رواج پانے لگی ملکی حسابات بھی اُردو میں تحریر کئے جانے لگے۔ اسی عہد سے اُردو زبان میں باقاعدہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا۔»

(سلاطین ہند کی علم پروری مصنفہ محمد حفیظ اللہ ص ۱۵۲)

علی عادل شاہ اول :

اس بادشاہ کو کتب بینی کا بہت شوق تھا بادشاہ کی سخاوت کی شہرت سن کر ایران، عراق، آذربائیجان، عربستان اور دوسرے اسلامی ممالک کے بہت سے علماء وفضلاء اور ارباب علم و فن بیجاپور آئے۔ کہا جاتا ہے کہ صرف شیراز سے دس ہزار افراد عادل شاہ کے دربار میں آئے اور انعام و اکرام اور وظائف لے کر واپس گئے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی :

یہ ایک بڑا جلیل القدر بادشاہ تھا۔ اس کا شمار ہندوستان کے ممتاز ترین بادشاہوں میں ہوتا ہے اس کے دربار میں علماء اور اہل کمال کا ایسا مجمع رہتا تھا کہ کم ہی دوسرے بادشاہوں کے دربار میں اتنے عالم و فاضل اور شاعر اکٹھے ہوئے ہوں گے۔ حکیم ابو القاسم فرشتہ نے ہندوستان کی مشہور عمومی تاریخ «گلشن ابراہیمی» جو عام طور پر اس کے مصنف کی نسبت سے «تاریخ فرشتہ» کہلاتی ہے۔ اسی بادشاہ کے نام سے موسوم کی تھی۔ بادشاہ خود مجسم شعر و موسیقی تھا۔ ہندوستانی موسیقی میں کمال کی بناء پر «جگت گرو» کا لقب پایا تھا۔ خوش نویسی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ خط نسخ و نستعلیق کا ماہر تھا۔ مصوری میں خاصی دستگاہ حاصل تھی۔ سنسکرت کا عالم تھا خود شاعر تھا اُردو میں مثنویاں، غزلیں اور گیت سب ہی کچھ اس نے لکھے تھے۔ اس کی لکھی ہوئی مثنویوں اور غزلوں کا تو اب پتہ نہیں البتہ اس کے گیتوں کا مجموعہ «کتاب نورس» اب بھی باقی ہے اور علمی دنیا میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی کتاب پر ملا ظہوری نے فارسی میں تین مقدمے لکھ کر صاحب «سہ نثر» کی حیثیت سے فارسی ادب میں نام کیا تھا۔

محمد عادل شاہ :

وہ خود شاعر نہ تھا لیکن شعر و سخن کا بڑا دلدادہ تھا۔ اُردو نواز سلطان اور اُس کی ملکہ خدیجہ سلطان گولکنڈے کے قطب شاہی خاندان کی شہزادی تھی

اور اپنے آباو اجداد کی طرح اُردو ادب کی شیدائی اور سرپرست تھی "خاور نامہ" سے اس کی ادبی دلچسپی کا ثبوت ملتا ہے۔

علی عادل شاہ ثانی شاہی:

بچپن ہی سے اس کو شعر و سخن کا ذوق تھا۔ وہ ایک اچھا شاعر تھا۔ شاہی تخلص کرتا تھا اُس کی مشق سخن اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اکثر اپنے مصاحبین کی نظموں کی اصلاح کیا کرتا تھا جس کی وجہ سے وہ اُستاد عالم کہلایا۔

ولی عہدی کے زمانے ہی سے وہ علماء و اہل کمال کا قدردان تھا۔ جب حکومت کی عنان سنبھالی تو اس کی علمی قدردانیوں میں اضافہ ہوا اُس نے علمائے وقت کو ہر طرف سے سمیٹ کر بیجاپور میں جمع کرلیا اس کا دربار باکمالوں کا سرچشمہ تھا۔ سلطان کے جود و سخا اور اس کی علمی لیاقت اور قابلیت و قدردانی علم و ہنر کے اکثر مورخ معترف ہیں۔ نصرتی اس کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔

بیجاپور کے عادل شاہی بادشاہوں کی حکومت دکن کی اُن یادگار زمانہ حکومتوں میں سے ایک ہے جسے تاریخ کبھی نہ بھلا سکے گی۔ عادل شاہی بادشاہ اپنے زمانے میں علم و ہنر کے بہت بڑے سرپرست ہوئے ہیں اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے اس تہذیب کی آبیاری میں بہت بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی اور ہندوستانی تہذیب کہلاتی ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ شہنشاہ اکبر نے اس ملی جلی تہذیب کو سب سے پہلے فروغ دیا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس تہذیب کی دانستہ اشاعت کا اولین سہرا اکبر کے سر نہیں بلکہ اکبر سے بہت پہلے دکن کی قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے سر بندھتا ہے اس تہذیب کی سب سے بڑی یادگار وہ زبان ہے جو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تمدنی ربط اور آپسی میل جول سے ظہور میں آئی اور ہندوئی یا ہندی کہلائی۔

اُردو کے اس دور کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کیجئے تو اس ادب میں بعض خصوصیات ایسی نظر آتی ہیں جن کے احیاء اور دوبارہ چلن کی شدید

ضرورت ہے۔ اس ادب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہمکو اپنے ملک کی روایات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

دکن میں صوفیاء کی تبلیغی مساعی کی وجہ سے نثر کی پہلے نشو و نما ہوئی گو یہ صحیح ہے کہ اس کے بعد نظم کی نشو و نما میں بھی زیادہ دیر نہیں لگی۔

خواجہ دکن حضرت بندگی مخدوم سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز کے بعد حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کا نام قدیم اُردو کے مصنفین میں سب سے زیادہ روشن ہے۔

شاہ میراں جی شمس العشاق :

شاہ میراں جی کی ہستی حقیقت میں اپنے عہد کی بڑی برگزیدہ ہستی تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب کا خیال تو یہ ہے کہ دکن میں اُردو کی نشو و نما بھی انہیں کے روحانی فیض کی بدولت ہوئی تھی۔

تاریخوں اور تذکروں میں شاہ میراں جی کی کئی تصانیف کا ذکر ملتا ہے اور یہ تصانیف نظم اور نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔

شاہ برہان الدین جانم :

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں :

«لسانیاتی نقطۂ نظر سے شاہ برہان الدین کے کارنامے محققین کیلئے کافی مواد پیش کرتے ہیں۔»

یہ صحیح ہے کہ قدیم دور میں شاہ برہان ہی وہ خوش قسمت بزرگ تھے جن کی اکثر تصانیف دستبرد زمانہ سے بچ رہیں اور جو قدیم ادب کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے نثر کی کئی تصانیف کے علاوہ آٹھ ہزار اشعار کا ایک گراں قدر سرمایہ بھی چھوڑا ہے جس سے اس زمانے کے لسانی، سماجی اور تہذیبی

رجحانات پر روشنی پڑتی ہے۔

شاہ امین الدین اعلیٰ:

شاہ امین الدین علی اعلیٰ نہ صرف اپنے زمانے کے شیخ کامل اور ولی واصل تھے بلکہ سلوک و طریقت کے میدان میں وہ ایک عہد آفریں شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی کئی منظوم تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ جن کا موضوع ظاہر ہے مذہب اور تصوف تھا

عبدل بیجاپوری:

۱۶۰۳ع میں عبدل نے اپنے محسن سلطان ابراہیم عادل شاہ کے حالات پر ایک طویل مثنوی "ابراہیم نامہ" کے نام سے قلم بند کی تھی۔

عبدل کی زبان میں ہندی کا اثر نمایاں ہے۔

عاشق دکنی کی دو مثنویاں ایک "اعتبار خمسہ" اور دوسری "تاریخ چہار پیر و چہاردہ خانوادہ" ملتی ہیں۔

شاہ ابوالحسن بن شاہ حبیب اللہ کی "سکھ انجن" اُردو کی قبل از ۱۰۲۵ھ کی مثنوی ہے یہ تقریباً ۴۰۰ ابیات پر مشتمل ہے۔

مقیمی:

مقیمی کی مثنوی "چندر بدن و مہیار" کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ "فتحنامہ بکھیری" اور "قصہ سومہار" کا ذکر بھی مقیمی کی تصانیف میں ملتا ہے۔

صنعتی:

"قصہ تمیم انصاری" کا مصنف صنعتی ہے۔ اس میں سوا تین سو سال پہلے کی اُردو کا نمونہ ملتا ہے۔ دوسری مثنوی "گلدستہ" ایک عشقیہ داستان ہے۔ یہ مثنوی قصہ "فغفور چین" کے نام سے چھپ چکی ہے۔

ملک خوشنود:

یہ شاعر پہلے سلاطین گولکنڈہ کا ایک غلام تھا اس کی پرورش محمد قلی قطب شاہ کے محل میں ہوئی۔ ایک معتبر نوجوان ہونے کی وجہ سے اسے محمد قلی قطب شاہ کی شہزادی خدیجہ سلطان کے ہمراہ خانگی نوکر کی حیثیت سے بیجاپور روانہ کیا گیا تھا۔

جیسا تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک خوشنود نے قصائد بھی لکھے ہیں اس کا دیوان ابتک نہیں مل سکا البتہ تین مثنویاں ملی ہیں۔
۱) ہشت بہشت ۲) بازار حسن یا جنت سنگار ۳) یوسف زلیخا۔

رستمی:

اردو (دکنی) خاور نامہ کمال خان رستمی بیجاپوری کا کارنامہ ہے۔ خاورنامے کا ترجمہ اس نے محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان کے کہنے پر کیا۔ خاورنامہ میں چوبیس ہزار اشعار ہیں یہ ابن حسام کی ایک فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے۔ جس کا نام بھی «خاورنامہ» ہی ہے۔

شوقی:

حسن شوقی کا تعلق عادل شاہی شعراء سے ہے۔ اس نے ایک نظم «میزبانی نامہ محمد عادل شاہ» لکھی ہے۔

نصرتی:

یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ نصرتی بیجاپور کے دکنی شاعروں کا سرتاج ہے۔ نصرتی کی تصانیف جو اب تک ہمیں دستیاب ہوئی ہیں وہ یہ ہیں:
۱) گلشن عشق ۲) علی نامہ ۳) تاریخ اسکندری ۴) قصائد و غزلیات و رباعیات

ہاشمی:

بقول مصنف «اردوئے قدیم» اس کا نام سید میراں اور وطن بیجاپور ہے

ہاشمی ایک پر گو شاعر تھا۔ اسکی تین ضخیم کتابوں اور ایک مختصر مثنوی کا پتہ چلتا ہے جن کے نام ہیں:
۱) ترجمہ احسن القصص ۲) یوسف زلیخا ۳) غزلیات کا دیوان ۴) پند و نصائح زنان

ہاشمی ریختی کو بہ حیثیت ایک منفرد صنف سخن کے پیش کرنے والا پہلا شاعر ہے۔

بحـــری:

قاضی محمود بحری بھی ایک پر گو شاعر تھا۔ زبان میں سلاست اور شیرینی ہے۔ خیالات بھی صاف اور سادہ ہیں چونکہ وہ صوفی مشرب تھا اس لئے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے اس کی مشہور مثنوی «من لگن» اسی رنگ میں ہے اور دکنی لٹریچر میں امتیازی حیثیت کی مالک ہے۔ اس کا کلیات ڈاکٹر حفیظ سید نے شائع کردیا ہے۔

دولت:

مرزا دولت شاہ نے امین کی نامکمل مثنوی «بہرام و حسن بانو» کو مکمل کیا۔

شاہ ملک:

شاہ ملک نے شریعت نامہ لکھی۔ یہ مذہبی مثنوی اس زمانہ میں بہت مقبول عام تھی۔

ایاغــــی۔

نصرتی کا ہم عصر تھا۔ اُس نے ایک مذہبی مثنوی «نجات نامہ» لکھی ہے۔

قـــدرتی:

اسٹیٹ سینٹرل لائبریری حیدرآباد میں قدرتی کی مثنوی قصص الانبیاء کا ایک

نسخہ ہے جس کے دس ہزار سے زیادہ شعر ہیں۔

مختار :

گیارہویں صدی ہجری کے آخری دور کا شاعر ہے۔ اس کی حسب ذیل مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں۔

۱) معراج نامہ ۲) نور نامہ ۳) قصہ مولود

مختار کا پورا نام میاں محمد مختار تھا۔ عادل شاہی سلاطین کے زمانہ کا شاعر تھا۔ مختار حضرت سید محمد گیسو دراز کے سلسلہ میں مرید بھی تھا۔

شغلی :

اس کا تعلق بیجاپور کے صوفی شعراء سے ہے۔ محمد باقر آگاہ ویلوری نے جو بیجاپوری الاصل تھے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کی ایک مثنوی "پند نامہ" کے نام سے موسوم ہے۔ جس میں ایک سو پانچ شعر ہیں وہ کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔

مرتضیٰ :

اس نے "وصل نامہ" کے نام سے ۳۱۹ ابیات کی ایک طویل مثنوی لکھی ہے۔ جس میں وحدۃ الوجود کے مسائل بیان کئے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ اگر انسان خدا میں گم ہونا چاہتا ہے تو اس کے لئے پہلے ضروری ہے کہ وہ کسی مرشد کا مرید بن کر اس میں گم ہونا سیکھے۔

معظم :

شاہ محمد حسینی معظم بیجاپور کا ایک اونچے درجے کا صوفی شاعر تھا۔ سقوط بیجاپور اور اورنگ زیب کی وفات تک اس کا بقید حیات ہونا ثابت ہے۔ معظم کی جو کتابیں بتائی جاتی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے :

۱) شجرة الاتقیاء ۲) گنج مخفی ۳) رسالہ وجودیہ ۴) وجود العارفین (نثر)
۵) مناظرہ عقل و عشق ٦) معراج نامہ ۷) نظم سی حرفی ۸) گلزار چشت

امین :

ڈاکٹر زور دکنی ادب کی تاریخ میں امین کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

"مقیمی کا ایک ہم عصر امین بھی تھا جس نے اسکی مثنوی چندر بدن و مہیار کو دیکھ کر ایک مثنوی بہرام و بانو حسن لکھی تھی۔ جس میں اپنے مرشد شاہ عالم کا ذکر کیا ہے لیکن وہ یہ مثنوی مکمل نہ کرسکا بلکہ اسی دور کے ایک اور شاعر مرزا دولت نے اس کی تکمیل کی۔

علی :

نصیر الدین ہاشمی رقمطراز ہیں :

"اس دور (عادل شاہی) کا ایک شاعر علی ہے۔ اس کی ایک مثنوی "پند دل بند" ہے۔

کریم :

اس کی ایک نظم "مدح شاہ میرانجی" اور ایک غزل دستیاب ہوئی ہے۔

محرمی :

خواجہ جان محمد محرمی چشتی قطب المشائخ کی تصانیف ہیں :

۱) مراۃ الحقایق ۲) تاج الحقایق ۳) رسالہ ہدایت الطریقہ ۴) مثنوی محرمی "شکارنامہ" (راقم الحروف کی تحقیق شدہ) اور ۵) وفات نامہ حضرت محمد شامل ہیں۔

وہ حضرت امین الدین اعلیٰ کا خلیفہ تھا اور اس نے اپنے مرشد کے وصال (۲۴ رمضان ۱۰۸۵ھ) کے آٹھ سال بعد انتقال کیا۔

فراقی :

سید محمد فراقی، مصنفہ مرآۃ الحشر

حسرتی :

ایک غزل گو شاعر تھا۔ ایک مختصر دیوان، «مثنوی گنج عقلی» اس کی تصانیف ہیں۔

غوثی بیجاپوری :

شہادت جنگ سلطانی، ریاض غوثیہ اس کی تصانیف ہیں۔

شاہ داول :

تین مثنویوں کا مصنف ہے :

۱) کشف الوجود ۲) کشف الانوار ۳) چار تن

شیخ محمود خوش دہان :

تصانیف : ۱) مثنوی علم الحیات ۲) مثنوی وجود نامہ یا مثنوی شیخ محمود ۳) مناجات ۴) کشف المقامات

مجرمی :

مثنوی «گلشن حسن و دل» یہ بھی سب رس کے قصے پر مبنی ہے۔

حسن صبغۃ اللّٰہی :

ایک تاریخی مثنوی «تاریخ بزرگان» کا مصنف ہے۔

تراب :

قصہ «ملا و مہ جبیں» کے نام سے ایک عشقیہ داستان نظم کی ہے۔

شاہ لگن:

«سوال و جواب» کے نام سے اس کی قبل از ۱۱۰۰ھ کی ایک مثنوی ملتی ہے۔

سید علی:

اس کی غزلیں وغیرہ ملتی ہیں۔

شیخ محمد عالم:

«کتاب المعجزات» نام کی اُس کی ایک مثنوی ہے۔

سید عبداللطیف:

غزلیں وغیرہ ملتی ہیں۔

کریمی:

راقم الحروف نے کریمی کی دو مثنویاں دریافت کی ہیں۔

۱) آخرت نامہ ۲) پھولمن

حضرت شاہ برہان صاحب:

«توحید حقیقت گفتار» کے نام سے ایک مثنوی ملتی ہے۔

شاہ شریف:

مصنف مثنوی «رسالہ کشف الاذکار»۔

سید خداوند:

مصنفِ مثنوی «بسم اللہ»

چاند صاحب:

مصنفِ مثنوی «حکایت معمہ چہار سخن»

سید میراں :

کلام سید میراں کے نام سے اس کا کلام دستیاب ہے ۔

حاجی حسن :

راقم الحروف کی دریافت کردہ مثنوی « مقبول مہجور » جس میں اولیاء اللہ کا حال وصال، ان کے مولد کا نام و نشان تفصیل سے بتلایا ہے ۔

میر محمد صادق لطیفی القادری المتخلص المشربی :

اس کے دو رسالے ملتے ہیں :

(۱) رسالہ شمس الحقایق (۲) رسالہ خوارق صادقیہ

شاہ افضل :

مصنف « توصیف نامہ محی الدین »

عبد المحمد ترین :

« شمایل نامہ » کا مصنف ہے :

فقیر :

« چار کرسی کا بیان » کے نام سے اس کی ایک نظم دستیاب ہے ۔

شریف محمد دکنی :

مثنوی « سُرود عشق » کا مصنف ۔

قادر :

اس نے غزلیں، مثنویاں اور مرثیے لکھے ہیں۔ اور « معجزہ خاتون جنت » کے نام سے سوا دو سو اشعار کی ایک مثنوی بھی ہے ۔

جس طرح شمال کے شاعروں میں کوئی ایک شاعر بھی ایسا مشکل سے ملے گا جس نے غزل نہ کہی ہو اسی طرح دکن کے شاعروں میں بھی مشکل ہی سے

کوئی ایسا شاعــــر ہوگا جس نے مثنوی نہ لکھی ہو ان شعراء نے اپنے کلام میں زندگی کے ہر پہلو کی تصویریں کامیابی سے کھینچی ہیں اخـلاق و مـوعظت ہو یا فلسفہ اور تصوف، عشق و محبت کی نزاکتیں ہوں یا جنگ و پیکار کی خون آشامیاں، بزم کی پُر کیف و سرور روئداد ہو یا مناظر قدرت کی سحر طرازیاں. تاریخ و سوانح کی حقیقت نگاری ہو یا معاشرتی موضوعات کی پیچیدگیاں، ان کو ان شاعروں نے نظم کا جامہ اس خوبصورتی سے پہنایا ہے کہ شاعری ساحری ہوگئی ہے.

إملا اور قواعد وغیرہ کے اعتبار سے جو لسانی خصوصیات ان میں پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں. (۱) ہائے مخلوط کو حـــذف کردیا گیا ہے. جیسے تجہ (تجھ) دیکنا (دیکھنا) سمجنا (سمجھنا) وغیرہ (۲) مضاف الیہ جمع ہو تو ضمیر اضافی اور حرف اضافت بھی جمع استعمال کی گئی ہے. جیسے ایمان کیاں صفتاں (ایمان کی صفت) (۳) واحد کے آگے «اں» کا اضافہ کرکے جمع بنائی گئی ہے. جیسے فعل سے فعلاں، عمل سے عملاں، صفت سے صفتاں وغیرہ.

(۴) بعض الفاظ کا إملا آج کے إملا سے مختلف ہے جیسے موں (منہ) وضاء (وضع) بات (بات) بیتھے (بیٹھے) وغیرہ (۵) بعض الفاظ کا تلفظ بھی گجری، مرہٹی سے متاثر ہے. جیسے منگنا (مانگنا) جاگا (جگہ) اندھارا (اندھـــیرا) وچھیں (پوچھے).

غـــرض عادل شاہی دور کا ادب سولھویں، سترھویں صدی کا ادب ہے. قدامت کی وجہ سے ممکن ہے کہ اُس کی زبان کے سمجھنے میں کہیں کہیں دشواری ہو لیکن انداز بیان اتنا سادہ اور سلیس ہے کہ بنیادی مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے.

«قدیم اُردو» میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق رقمطراز ہیں:

«اُردو نے اگرچہ شمالی ہند یعنی گنگا جمنا کے دوآبے میں جنم لیا لیکن بات چیت، کام کاج، سودا سلف تک محدود رہی. اہل علم نے اسے کبھی منہ نہ لگایا اور اس لئے اس نے تقریر سے نکل کر تحریر کی کھیکڑ نہ اٹھائی سب سے پہلے ادبی صورت اس نے دکن میں حاصل کی اور دکنی کہلائی اور گروہ عوام سے نکل کر مجلس خواص میں آئی شعـــرائے دکن جنکی تخئیل کی جولانگاہ فارسی

زبان تھی۔ اب اس نئی زبان میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ جب تک اُردو زبان زندہ ہے دکن کو اس کا فخر حاصل رہے گا اور اُردو زبان کی کوئی تاریخ اس تذکرہ سے خالی نہ ہوگی۔»

اُردو زبان جس نے شاعری کا چراغ دکن میں روشن کیا خود نیر اعظم بن کر دہلی کے عرش پر چمک اُٹھی۔ تدریجی منازل کو طے کرتی ہوئی یہ زبان اس قابل ہوگئی کہ دقیق سے دقیق اور لطیف سے لطیف مضامین کو بہت آسانی سے ادا کرسکتی ہے۔

بیجاپور میں دکنی نے اپنے آپ سے جتنا کنڑی زبان کو متاثر پایا ہے، اس سے کہیں زیادہ کنڑی زبان کو متاثر کیا ہے۔ کنڑی زبان میں عربی فارسی کے سینکڑوں الفاظ اُردو کے ذریعے صدیوں سے مستعمل ہوتے آرہے ہیں۔

عادل شاہی دور کے ادب میں آپ کو اپنے ملک کی روایات کی پوری عکاسی ملے گی۔

کتابیات

واقعات مملکت بیجاپور	بشیر الدین احمد
اُردو شہ پارے	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ	مولوی عبدالحق
اُردو نثر کا آغاز و ارتقاء	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ
بجھتے چراغ	پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی
بیجاپور کی اُردو مثنویاں	ڈاکٹر قیوم صادق
دکنی غالب ملا وجہی	» » »
دکنی ادب	» » »

امام بخش صہبائی اور اردو زبان و ادب

از

جناب ایم. ریاض حسین صاحب، خدا بخش لائبریری، پٹنہ - ۴

امام بخش صہبائی کے علمی و ادبی سرمایے میں زیادہ تر فارسی نگارشات ہیں. اسی زبان کی زلفیں سنوارنے اور گیسوؤں کو سلجھانے اور آراستہ کرنے میں ان کی زندگی کا بیشتر وقت گذرا خواہ شرح نویسی کا میدان ہو یا تنقید نگاری کا، فن معما ہو یا انشاپردازی، مکتوب نگاری ہو یا عروض و قوافی کا فن، علم محاکمہ ہو یا موازنہ، غرض ہر فن پر ان کو ید طولیٰ حاصل تھا.

اگرچہ صہبائی کی محبوب زبان فارسی تھی، اور ہندوستان کے چند ممتاز ترین فارسی شناسوں میں ان کا شمار ہوتا ہے، جو ہندی نژاد ہونے کے باوجود ہزاروں فارسی دانوں میں اپنی لطافت بیان، ندرت ادا، جدت مضامین اور کلام میں پختگی کے باعث ممتاز اور نمایاں ہیں. لیکن بعض اہل کرم کی فرمائش پر اس «آتش پارسی» کے بخاری کو اردو زبان کی طرف بھی راغب ہونا پڑا اور یہاں بھی انہوں نے اپنی خداداد صلاحیت اور استادانہ مہارت سے کام لیتے ہوئے چند قیمتی، معیاری اور گرانقدر خدمات انجام دیں، جو آج بھی عظمت و وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں.

باوجودیکہ امام بخش صہبائی کی اردو خدمات صرف چند ہیں البتہ ان کے شاگردوں کی ایک لمبی فہرست ہے، جو اکثر ریختہ کہا کرتے تھے، انہیں سے اصلاح سخن لیا کرتے تھے اور وہ بھی خوب اصلاح دیا کرتے تھے. ان میں چند کے نام دیے جاتے ہیں، جن سے امام بخش صہبائی کی اردو خدمات کا بخوبی اندازہ ہوجائیگا میر حسین تسکین، نثار علی نثار، محمد حسین بحر انصاری، پنڈت اجودھیا پرشاد، شاہزادہ مرزا پیارے رفعت، مرزا شاہرخ، مولا بخش قلق، عنایت خاں عنایت، مولوی رحیم بخش طرب، عبدالعزیز عزیز، عبدالکریم سوز اور مولانا محمد حسین آزاد وغیرہ. یہ وہ حضرات ہیں، جن کی اردو خدمات سے کسی کو انکار نہیں اور یہ استاد کی استادانہ مہارت کا بین ثبوت ہے.

عام طور پر «ترجمہ حدائق البلاغت»، انتخاب دواوین اور قواعد صرف و نحو، صہبائی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ گارساں دتاسی لکھتے ہیں:

«سب سے آخر میں قابل ذکر صہبائی کی تصانیف ہیں، جن کے نام ہیں: حدائق البلاغت، انتخاب نظم اور قواعد اردو»[1]

اس کے علاوہ ایک اور کتاب «دیوان خواجہ میر درد» کا نام بھی ملتا ہے۔ تنویر احمد علوی کے مطابق۔

«انہوں (صہبائی) نے دہلی کالج کے لئے خواجہ میر درد دہلوی کے اردو دیوان کو بھی مرتب کیا تھا اور دہلی کالج کے مطبع ہی سے اس کی اشاعت عمل میں آئی تھی۔ دیوان درد کی اس نادر اشاعت کا ایک نسخہ ہارڈنگ لائبریری، دہلی میں محفوظ ہے»[2]

امام بخش صہبائی کی پہلی اردو تخلیق کونسی ہے۔ عام طور پر ترجمہ حدائق البلاغت اُن کی پہلی اردو تصنیف مانی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے علاوہ کوئی دوسری تصنیف ایسی نہیں ملتی ہے، جو اس سے قبل کی ہو۔ لیکن اتنا طے ہے کہ صہبائی نے اس کا ترجمہ دہلی کالج کے پرنسپل بوتـــرو کی فرمائش پر کیا۔ چنانچہ پرنسپل بوترو کا صہبائی سے حدایق البلاغت کا ترجمہ کروانا، ثابت کرتا ہے کہ اردو میں بھی ان کو دستگاہ کامل حاصل تھی اور کچھ چیزیں اس ترجمہ سے قبل اردو میں آچکی تھیں۔ ورنہ کچھ نہ کچھ بنیاد ہونی چاہئے، جس کی بنا پر ان سے ترجمہ کی فرمائش کی گئی۔ پرنسپل بوتـــرو جیسا دانشور اور زمانہ شناس کسی مبتـدی کو یہ اہم کام نہیں سونپ سکتا جبکہ اس زمانے میں اردو کے ایک سے ایک ماہرین موجود تھے۔ نیز یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ اس کے ترجمہ میں صہبائی نے جو زبان اختیار کی ہے وہ ان کے بعض معاصرین کے مقابلے میں زیادہ سلیس، رواں اور مدلل ہے۔ البتہ کوئی ٹھوس ثبوت ایسا دستیاب نہیں ہے، جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ «ترجمہ حدایق البلاغت» صہبائی کی پہلی اردو تصنیف نہیں ہے۔

۱ خطبات گارساں دتاسی ص ۱۶۴ ۲ انتخاب دواوین (مقدمہ) ص ۱۴

«حدایق البلاغت» کی زبان فارسی ہے اور میر شمس الدین فقیر دہلوی کی شاہکار تصنیف ہے فقیر اپنے وقت کے ممتاز عالم تھے اور فن عروض و قوافی میں تو اس وقت ان کا کوئی نظیر نہ تھا۔ [1] انہوں نے ۱۱۶۸ھ/۵۵-۱۷۵۴ع میں اسکی تصنیف کی یہ کتاب نہایت اہم قابل قدر اور معتبر تصور کی جاتی تھی اور اس زمانے کی درسیات میں شامل تھی۔

اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر پرنسپل بوترو (دہلی کالج) نے صہبائی سے اس کو اردو میں منتقل کرنے کی فرمائش کی۔ اس ترجمہ کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے صہبائی لکھتے ہیں۔

«بوترس صاحب..... ارشاد کیا کہ اگر یہ نسخہ فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا جاوے اور اس میں عربی اور فارسی مثالوں کی جگہ اردو زباندانی ہند کے مندرج ہوں تو ان لوگوں کے واسطے کہ اردو اشعار سے ذوق رکھتے ہیں ..... بہت مفید ہوگا۔ اس واسطے اس خاکسار نے بموجب اس کے کہ المامور معذور باوجود کمی استعداد کے تقدیم امر میں سعی کرکے اس رسالہ کو ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ع میں مرتب کیا» [2]

عروض و قوافی کے فن پر اردو میں یہ پہلی کاوش ہے۔ محمد یحیی تنہا لکھتے ہیں:

«یہ اردو میں اس فن کی پہلی مکمل اور مستند کتاب خیال کی جاتی ہے۔» [3]

یہی خیال مولانا حامد حسن قادری کا بھی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

«یہ اردو میں اس فن کی پہلی مکمل اور مستند کتاب ہے» [4]

جب یہ ترجمہ منظر عام پر آیا تو اتنا مقبول ہوا کہ پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور دوسرے ایڈیشن کی نوبت جلد ہی آگئی۔ مولوی کریم الدین اس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں

---

۱ گلشن بیخار ص ۱۵۲ ۲ ترجمہ حدایق البلاغت ص ۲

۳ سیر المصنفین ۱/ ۲۳۵ ۴ داستان تاریخ اردو ص ۲۰۳

«یہ ترجمہ درمیان ۱۸۴۳ع کے سید عبدالغفور کے اہتمام سے سیدالاخبار دہلی درمیان کوچۂ چیلان کے چھپا۔ بعد ازاں ۱۸۴۴ع میں میرے اہتمام سے بھی وفاء عام واقع حوض قاضی میں چھپا۔»[1]

مترجم نے لفظ بلفظ ترجمے کے اصول کے برخلاف معانی کی وضاحت پر خاص دھیان دیا ہے اور اسے عام فہم بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور ساتھ ساتھ فقیر کی حامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ گویا اپنے ناقدانہ مزاج اور تنقیحانہ فطرت کو بھی دعوت سخن دی ہے۔ اس طرح یہ ترجمہ اصل کتاب سے بہت مختلف ہوگیا ہے۔ چنانچہ بعض مباحث ایسے بھی جو اصل کتاب سے زیادہ ہیں صہبائی نے خود اس کی سراحت کی ہے :

«...... بہت مسائل اصل کتاب سے زیادہ کردیے ہیں اور ازبسکہ لفظ بلفظ کے ترجمہ میں مطلب کی توضیح خوب نہیں ہوتی۔ اس لئے ترجمہ میں اس امر کا مقید نہیں ہوا۔»[2]

صہبائی کا یہ قول تعلی پر محمول نہ کیا جائے بلکہ یہ ان کی حقیقت بیانی ہے، جس کا شاہد ان کا ترجمہ ہے اور نقادان فن کی اس پر رائیں ہیں۔ مولوی کریم الدین کی رائے میں :

«.... حدایق البلاغت کا ترجمہ..... زبان اردو میں اس شخص نے بہت اچھا کیا ہے۔ جو حق ترجمہ کا ہوتا ہے وہ ادا کیا ہے۔»[3]

محمد یحیی تنہا کا خیال ہے :

«صہبائی مرحوم کی زبان صاف اور رواں ہے..... آپ کی اصل عبارت اور ترجمہ یکساں معلوم ہوتا ہے..... بہرحال یہ بھی صہبائی مرحوم کی قادر الکلامی ہے کہ وہ ایسی عبارت لکھ سکتے تھے۔»[4]

گارساں دتاسی رقمطراز ہیں :

---

۱ طبقات الشعرا ۲ ترجمہ حدایق البلاغت ص ۳ ۳ طبقات الشعرا

۴ سیر المصنفین ۱/۳۷-۲۳۶

"۔۔۔۔ ترجمہ کیا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ انہوں نے اس کتاب کے مطالب کو اردو شاعری پر ڈھال لیا ہے۔"[1]

اور مولانا حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

"صرف کہنے کو ترجمہ ہے ورنہ اصل میں فن بلاغت کو اردو میں منتقل کیا ہے۔"[2]

اس ترجمہ کے خصوصی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ صہبائی کو اردو نظم و نثر اور اسکے رموز و نکات اور مسائل و معاملات سے کس قدر شغف تھا۔ اور کس درجہ ان کے افکار میں بالیدگی اور نظر میں گہرائی و گیرائی تھی اس کے باوجود کہ یہ ترجمہ اصل سے کہیں زیادہ مفید اور اس سے ہٹ کر ہے پھر بھی یہ ان کی علمی دیانتداری ہے کہ انہوں نے اس کو ترجمہ ہی کہا، کسی دوسرے نام سے یاد نہیں کیا البتہ فہرست نمائش مرتبہ قاضی عبدالودود نے "ہدایت البلاغت، غالباً صہبائی کا ترجمہ"[3] کے نام سے ایک کتاب کی نشاندھی کی ہے۔ لیکن اس نام سے صہبائی کی کوئی تصنیف نہیں ملتی ہے۔ گمان غالب ہے ترجمہ حدائق البلاغت کو کسی نے ہدایت البلاغت کے نام سے متعارف کرایا ہو۔

اردو کے سلسلے میں صہبائی کی دوسری اہم خدمت، جو اولیت کا درجہ رکھتی ہے، انتخاب دواوین ہے۔ عرصہ تک صہبائی کی یہ کاوش نظروں سے اوجھل رہی۔ صرف تذکروں میں اس کا نام ملتا تھا۔ ڈاکٹر نور احمد علوی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے نہ صرف کافی تلاش و جستجو کے بعد اس نسخہ کو ڈھونڈا بلکہ ذاتی محنت اور لگن سے اسے شائع بھی کیا۔

انتخاب سے قبل صہبائی نے آغاز میں ۳۱ صفحات پر مشتمل ایک وقیع مقدمہ بھی سپرد قلم کیا ہے جس میں ہندوستانی شاعری اور اس زبان کی خاص خاص نظموں کی بحروں پر بحث کی گئی ہے پھر حسب ذیل شعرا کا انتخاب پیش کیا گیا

---

۱ خطبات گارساں دتاسی ص ۹۵ ۲ داستان تاریخ اردو ص ۲۰۳

۳ فہرست نمائش ص ۱۱۷

ہے اور ساتھ ہی شاعروں کے مختصر حالات بھی درج ہوئے ہیں :

(۱) شمس ولی اللہ ص ۸۰ (۲) خواجـــہ میر درد ص ۹۶ (۳) سودا ص ۱۳۰ (۴) میر ص ۶۷ (۵) جـــرأت ص ۱۹۹ (۶) میر حسن ص ۲۳۶ (۷) نصیر ص ۲۴۸ (۸) ممنـــون ص ۲۶۴ (۹) ناســـخ ص ۲۸۶ (۱۰) ذوق ص ۳۲۲ (۱۱) مومن ص ۳۴۹ اخیر میں گیتوں کا انتخاب ہے۔

چونکہ صہبائی نے شاعروں کے ضروری حالات بھی رقم کئے ہیں۔ اس لئے تذکرہ نگار اس کو تذکروں میں شمار کرتے ہیں گارساں دتاسی کے بقول :

«اسے ہم محض انتخــاب نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ انتخابات کے ساتھ ساتھ شاعروں کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کا تذکرہ ہے۔» [1]

مولوی ذکاء اللہ تحریر فرماتے ہیں :

«اگرچہ انتخاب دواوین ہے . . . . . لیکن اس میں کچھ کچھ شاعروں کا بھی حال ہے۔ اس سبب سے اس پر تعریف تذکرہ کی صادق آتی ہے۔» [2]
ڈاکٹر فرمان فتحپوری اس انتخاب پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

«کسی شاعر کے کلام کا انتخاب دس بارہ صفحہ سے کم میں نہیں ہے۔ ہر صفحہ میں بیس اشعار ہیں شعرا کے حالات بھی درج ہیں لیکن مختصر . . . . غالب، ذوق اور مومن جن سے صہبائی بخوبی واقف تھے۔ ان کے متعلق بھی صرف چند سطریں ہی لکھی ہیں۔» [3]

لگتا ہے کہ ڈاکـــٹر موصوف کی رسائی اس انتخاب تک نہ ہوسکی تھی صرف تذکروں کے مطـالعہ سے ہی یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ غالب کا سرے سے نام ہی نہیں ہے۔ اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ صہبائی نے، جو غالب کی صلاحیت کے معترف تھے، کیوں اس انتخاب میں غالب کو شامل نہیں کیا۔

۱ خطبات گارساں دتاسی ص ۴۹ ۲ رسالہ تذکرات ص ۳۷
۳ اردو شعرا کے تذکرے ص ۳۲۲

اس کا کوئی ٹھوس اور مدلل جواب پیش کرنا مشکل ہے۔ البتہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ خود غالب کی نظر میں ان کی اردو شاعری "بیرنگ" تھی۔ اسی کا خیال کرکے انہوں نے اس انتخاب میں غالب کو شامل نہیں کیا۔ اس کے علاوہ چند اور خامیاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً اردو شاعری کی بحث میں زیادہ تر مومن کے اشعار ہی کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔ جو ظاہر کرتا ہے کہ صہبائی نے بالاستیعاب شعرا کے دواوین کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ مثنوی میں جو بحریں استعمال ہوتی ہیں ان کا ذکر تو ہوا ہے لیکن نام بتانے سے گریز کیا گیا ہے۔ اصناف کی تعریفیں مبہم ہوگئی ہیں۔ مرثیہ، معما اور تضمین کو بالکل نظر انداز کردیا گیا ہے۔ سودا کے بارے میں کہنا کہ "وہ ایام جوانی میں لکھنؤ کو گیا" تاریخی اعتبار سے محل نظر ہے۔ نیز صہبائی کی تنقیدی رائیں سرسری اور سطحی معلوم ہوتی ہیں۔ شعرا کا مقام متعین کرنے میں بھی ان سے فروگذاشتیں ہوئی ہیں۔ لیکن ان خامیوں کے باوجود بھی اسکی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ انیسویں صدی کے علم و ادب کی داستان صہبائی کے بغیر نامکمل ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس قسم کی پیش کش اس سے قبل کسی نے نہیں کی۔ اسی کو بنیاد بنا کر مولوی کریم الدین نے گلدستہ نازنیناں کی تصنیف کی۔ اس لحاظ سے اس فن کا موجد اور موسس صہبائی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

اردو کے باب میں صہبائی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ پرنسپل بوترو کی فرمائش پر انہوں نے اردو قواعد پر قلم اٹھایا اور اس کو چار ابواب اور ایک مقدمہ پر منقسم کیا۔ مقدمہ میں اردو زبان کے آغاز و ارتقاء سے بحث کی گئی ہے، جو تاریخی حیثیت سے قابل اعتنا اور لائق توجہ ہے۔

اردو قواعد پر صہبائی سے قبل ہی بہت ساری کتابیں لکھی گئی تھیں۔ صہبائی کا امتیاز اور ان کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کا طریقۂ تکلم زیادہ واضح، صاف اور مدلل ہے اور خصوصی توجہ کا باعث چوتھا باب ہے، جس میں روزمرہ، محاورات اور ضرب الامثال کو قدرے تفصیل و صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس رسالے کی اہمیت بتاتے ہوئے گارساں دتاسی لکھتا ہے۔

« ان کی قواعد اردو اس وجہ سے اور بھی زیادہ قابل قدر ہے کہ اس کے آخر میں ضرب الامثال اور محاورات کی ایک فہرست درج ہے ۔ »[۱]

اور مولوی عبدالحق رقمطراز ہیں :

«اردو صرف و نحو پر بھی ایک اچھی کتاب لکھی، جس کے آخر میں بہ ترتیب حروف تہجی اردو کے محاورات اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی درج ہیں ۔ »[۲]

محاورات اور ضرب الامثال پر سب سے پہلے شاہ برکت اللہ پیمی نے قلم اٹھایا ۔ « عوارف ہندی » ان کی تصنیف ہے ۔ جو فارسی زبان میں ہے ، لیکن ضرب الامثال کی تشریح کا کام سب سے پہلے صہبائی نے ہی کیا ہے ۔ وہ اہل علم اور اہل زبان کی بول چال کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور لوگوں سے اسکی توقع رکھتے تھے کہ اس کو عمل میں لایا جائے اردو زبان کے بارے میں ان کا نظریہ بالکل واضح اور صاف تھا۔ اس سلسلہ میں اپنے نظریہ کی وضاحت « قول فیصل » میں کردی ہے

«ایرانی نژاد اگر صد سال در ہند بگذارند در فصاحت زبان اردو با چہار سالہ طفلگی برنیاید »[۳]

مذکورہ کتابوں کے علاوہ صہبائی کی کوئی اور اردو نگارش کا پتہ نہیں چل سکا ہے ۔ اسکی وجہ یہ ہوئی کہ ڈاکٹر اسپرنگر کے دور میں صہبائی کی وہ پذیرائی نہیں ہوئی، جو پرنسپل بوترو کے عہد میں تھی اس لئے وہ اپنے اصلی شوق یعنی فارسی تصنیف و تالیف میں ہمہ تن مشغول ہوگئے ۔

صہبائی کی اردو تصنیفات میں جو اسلوب بیان اور طرز ادا اپنایا گیا ہے وہ فارسی نگارشات کے مقابلے میں سلیس، رواں، سہل اور شیریں ہے ، تعقید، پیچیدگی خیال در خیال اور استعارہ در استعارہ کے اوصاف سے پاک ہے ، معلوم ہوتا ہے کہ جملوں کی ساخت وغیرہ کے معاملوں میں وہ فارسی کی تقلید سے آزاد ہوچکے تھے ۔ اس کے برعکس آثار الصنادید کا اسلوب ہے ، جسے بعد میں سر سید نے آسان اردو میں چھپوایا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دونوں اسالیب پر یکساں قدرت رکھتے تھے ۔ اگر یہی آسان اور سہل زبان وہ اپنی فارسی نگارشات میں

---

۱ خطبات ص ۱۶۴   ۲ مرحوم دہلی کالج ص ۱۴۹   ۳ قول فیصل ص ۴

اپنائیے تو آج غالب اور اقبال کی طرح ان کو بھی پڑھا جاتا۔

اردو شاعری کے باب میں صہبائی کی کوئی خاص خدمت نہیں ہے اور نہ کسی مجموعہ کا پتہ ہے چنانچہ کسی بھی تذکرہ نگار نے صہبائی کو اردو شاعر کی حیثیت سے متعارف نہیں کرایا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے شاگرد مولوی کریم الدین اور مرزا قادر بخش صابر اور ان کے رفیق غم گسار سر سید نے بھی ان کی اردو شاعری پر اظہار خیال نہیں کیا ہے۔ البتہ حکیم نجم الغنی خاں نے اپنی کتاب "بحر الفصاحت" میں بعض اردو اشعار کو صہبائی سے منسوب کیا ہے لیکن اس انتساب کی کوئی سند انہوں نے پیش نہیں کی ہے اصل بات یہ ہے کہ صہبائی نے ترجمہ حدایق البلاغت میں بعض اشعار بغیر شاعر کے نام کے درج کئے ہیں، اسی کو حکیم صاحب نے صہبائی کا طبع زاد کلام تسلیم کیا ہے اور یہ درست بھی معلوم ہوتا ہے، جس کا اعتراف خود مولوی کریم الدین نے کیا ہے کہ:

"..... مگر چند (اشعار) ان کی تصنیف حدایق البلاغت کے ترجمہ میں اردو (کیے) ہیں "[1]

جن اشعار کو حکیم نجم الغنی خاں نے صہبائی سے منسوب کیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:

دیکھنا منھ لال ہو جائیں گے کس کس کے ابھی
سامنے میرے جو برگ سبز پان تو نے دیا[2]

شب کو جشن سرور تحت رہا　　کار فیض مدار بخت رہا[3]

زلف اس مہ وش کے رخ پر اک دخاں ہے آگ پر
اور رخ اس مہر وش کا شعلۂ زیر دخاں
ہائے یوں ہو اس دخاں سے تیرہ اپنا روز عیش
اور اس شعلے سے یوں روشن ہو شام دشمناں[4]

تجھے اور تیرے دشمن کو سوا ہے اوج عالم میں
تجھے بخت خلافت پر، اسے دار سیاست پر[5]

---

۱ طبقات الشعرا ص ۳۱۲　۲ بحر الفصاحت ص ۱۰۲۲، ترجمہ حدایق البلاغت ص ۶۸　۳ بحر الفصاحت ص ۹۷۹　۴ ایضاً ص ۱۰۶۸　۵ ایضاً ص ۱۰۷۳

کہتا ہے کہ اب نہ کھینچ تو آہیں		ہیں دل سے تیرے تو ہم تلک راہیں[۱]

بیٹھا ہے وہ رقیب کے جو پہلو میں		اٹھا یہ درد دل کہ کھینچی آہ[۲]

آتش غم ایسی کچھ بھڑکی کہ پل میں ہوگیا
داغ دل سے آفتاب روز حشر آشکار[۳]

مجھے دیکھ کر تیغ کو دیکھتے ہیں		غرض یہ کہ ہو خون ناحق کسی کا[۴]

ان میں بعض اشعار کا اور اضافہ ہوسکتا ہے۔ جب صہبائی کو حدایق البلاغت کے ترجمہ کے وقت بعض صنعتوں کی مثال اردو شاعری میں نہیں ملی، تو خود سے شعر کہہ کر اس کمی کو پورا کردیا۔ مثلاً صہبائی لکھتے ہیں کہ «اس وزن میں اشعار دیکھے نہیں گئے۔ بہرحال مثال اسکی یہ ہے» ؂

دل و جگر خون ہے مرا		سرشک خون بہتے سدا

بار غم کا اٹھانا ہی پڑا آہ		داغ ہجر کو کھانا ہی پڑا آہ

تیرے قد سے ہے صنوبر اب خجل		تیری زلفوں سے ہمیشہ شب خجل

غبار آکے ترے دل میں پھر نہ نکلا		غبار ہم کو تری طرف سے پھر نہ آیا

صہبائی کا انداز تحریر صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ اشعار ان ہی کے ہیں، ورنہ وہ یہ نہیں لکھتے کہ اس وزن میں شعر نہیں دیکھے گئے۔ پھر بھی کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے، جس کی بناء پر کہا جائے کہ یہ اشعار صہبائی ہی کے ہیں۔ البتہ قیاس کی بناء پر ان کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے اور جب تک اسکی کوئی تردید نہ ہو، صہبائی ہی سے یہ اشعار منسوب کئے جائینگے۔

مذکورہ بالا اشعار میں ایک قطعہ کے علاوہ بیشتر غزل کے ہیں۔ ایک دو شعر قصیدے اور مثنوی کے معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو شاعری کے مروجہ اصناف میں شعر کہتے تھے۔ صہبائی نے کوئی پورا قصیدہ یا مثنوی کہی تھی یا نہیں، اس بارے میں کوئی معلومات دستیاب نہیں ہیں۔

• • •

---

۱ بحر الفصاحت ص ۱۹۰	۲ ایضاً	۳ ایضاً ص ۱۰۴۷	۴ ایضاً ص ۹۵۳

کتابی دنیا

کوکن میں اردو تعلیم

(مصنفہ عبدالرحیم نشتر)

تبصرہ از

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

ہندوستان جنت نشان کے مغربی ساحلی علاقوں پر سب سے پہلے حجاج بن یوسف کے دوران حکومت میں حجاز سے عرب مہاجرین کے جہازات کلیان، تھانہ سوپارہ اور داپول کی بندرگاہوں پر پہنچے اور وہ مہاجرین یہیں کے ہوکر رہے اور عصری تقاضوں کے پیش نظر انکی زبان، انکی تہذیب اور انکا دستور حیات مقامی حالات سے غیر شعوری طور پر اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ اپنے آپ کو کوکن کے سپوت کہلانے لگے اور "کوکنی" کے نام سے موسوم ہوگئے۔ حتیٰ کہ علاقۂ کوکن جو شہر بمبئی، تھانہ ضلع، قلابہ ضلع، رتناگیری ضلع کے ساتھ، جنجیرہ ریاست پر مشتمل ہے، کے شہری کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ یہ سچ ہے کہ کوکن کے علاقہ میں ابن بطوطہ جیسے سیاحوں، سلیمان التاجر جیسے تاجروں، مخدوم علی شاہ فقیہہ جیسے صوفیوں اور ایرانی، ترک، افغان، مغل اور سِدّی جیسے حکمرانوں اور نوابوں نے اپنے قدم جمائے اور نفوذ و اثرات سے مشترکہ تہذیب و تمدن کی بنیو ڈالی اور اہالیان کوکن یعنی کوکنیوں نے اپنے مذہبی اثاثہ، قومی ورثہ اور عوامی زبان کو اس خطہ کی خلط ملط تہذیب سے وابستہ کرلیا۔

زیر نظر کتاب "کوکن میں اردو تعلیم" میرے عزیز محترم ابراہیم سندیلکر

صاحب کے توسط سے مجھ تک پہنچی جس کو صاحبِ کتاب ڈاکٹر عبد الرحیم نشتر صاحب «مردِ آہن» کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن میری رائے میں صحیح معنوں میں وہ «مردِ آہنگ» ہیں کیونکہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے جنجیرہ مروڈ کے انجمن اسلام کے ادارہ، ناگپاڑہ بمبئی کے انجمن خیر الاسلام کے مہاراشٹرہ کالج اور بمبئی نوری بندر کی انجمن اسلام کے صدر دفتر میں ایک رفیق بلکہ ناظم کی حیثیت سے وابستہ رہا ہے۔ سدیلکر صاحب خوش مزاج ہونے کے باوجود مرنجانِ مرنج ہیں اور بڑی خوش اسلوبی سے کہا کہ میں اس کتاب کے بارے میں دو لفظ لکھوں اور بس ان کے حکم کی تعمیل میں اپنے خیالات پیش کرنے کی میں جسارت کر رہا ہوں اس خواہش کے ساتھ کہ آئندہ ایڈیشن میں ممکن ہو تو جگہ دیں ورنہ نظر انداز کردیں ملال نہ ہوگا۔

ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر صاحب سے غائبانہ تعارف تو تھا ہی اور کتاب کو دیکھکر بہت متاثر ہوا۔ طباعت و اشاعت کے لحاظ سے اور مواد و اسلوب کے اعتبار سے صاحبِ موصوف کی مساعی قابلِ تحسین ہیں اور مبارکباد کی مستحق ہیں۔

نشتر صاحب نے اپنی کتاب کے تعلق سے لکھا ہے کہ تعلیم و تہذیب کا یہ ایک تجزیاتی مطالعہ ہے اور ابتدائی کلمات میں انہوں نے کوکن میں اردو کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے اگرچہ یہ کوکن کے ایک حصہ سے متعلق ہے۔ شہر بمبئی، ضلع تھانہ، ضلع رتناگیری اور ضلع قلابہ کے کوکنی حضرات کی اردو دانی علم دوستی اور علم پروری پر اگر لکھا ہے تو دبی زبان سے حالانکہ ان علاقوں میں اردو کی ترویج و اشاعت اور فروغ و تحفظ میں ان کا اہم رول رہا ہے جو ہر لحاظ سے قابلِ احترام و لائقِ تحسین ہے۔ اس سلسلے میں میری یہ دلی خواہش ہے کہ صاحب کتاب نشتر صاحب کوکن کے مشاہیر سپوتوں میں پرنسپل عبدالقدوس منشی صاحب، ڈاکٹر یونس اگاسکر صاحب، جناب قادری مہر مہسلائی صاحب اور جناب انجم عباسی صاحب سے رابطہ قائم کریں اور ان سے تبادلۂ خیال کر کے دوسرے ایڈیشن میں کتابِ مذکور کو اردو ادب کے ذخیرہ میں ایک قابلِ قدر اضافہ کی صورت میں پیش کریں تاکہ اہالیانِ کوکن بالخصوص اور محبانِ اردو بالعموم کوکن میں

اردو کی خدمات کے تعلق سے اس کتاب کو ایک انسائیکلوپیڈیا تسلیم کرسکیں۔

شہر بھیونڈی کے تعلیمی و ثقافتی اداروں کو آگے بڑھانے میں روگھے، کھتکتے اور کرتے خانوادوں کا ذکر ضروری ہے۔ اسی طرح مولوی محمد ابراہیم مقبہ صاحب کا «تعلیم نامہ» اور جناب عبدالحمید بوبیرے صاحب کے ماہنامہ «صبح امید» کی اردودانی اور علم دوستی کے بارے میں لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ضیا پارسی صاحب، غلام رسول آغا صاحب اور ظریف نظامپوری کے اردو کلام پر تبصرہ قلم بند کرنا گویا کتاب کی اہمیت کو بڑھانا ہے۔ اساتذۂ کرام میں جناب عبدالعزیز نختارے صاحب، جناب عباس غوری صاحب اور حافظ عبدالقادر گوریکر صاحب کی تدریسی خدمات کو اجاگر کرنا چاہئے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جو بھیمڑی میں کوئی ۱۹۲۵ء میں منعقد ہوئی تھی اور جس میں مولانا محمد علی، حکیم اجمل خان اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی مختار شخصیتوں نے شرکت کی تھی جس کی فکری بصیرت کے رد عمل کے طور پر بھیمڑی میں کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی ضلع تھانہ کا قیام ۱۹۲۷ء میں عمل میں آیا اور ضلع تھانہ کے رؤسا میں بالخصوص رفیع الدین فقیہہ صاحب، محمد حسین مدعو صاحب، آنا دیوکر صاحب، امیر صاحب رئیس، معین الدین حارث صاحب وغیرہ نے اہتمام کیا تھا اور انہی کی کوششوں کے نتیجے میں بھیمڑی اور اطراف میں اردو تعلیم کا فروغ ہوا۔ مزید یہ کہ کلیان میں ایجوکیشنل اپلفٹ سوسائٹی کا آغاز ۱۹۵۷ء میں ہوا جہاں کوکنی حضرات میں قاضی صاحب، روہے صاحب، بانز صاحب اور گوریکر صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور آج یہ ایک بڑا تعلیمی ادارہ بن گیا ہے۔

یہ چند نکات میں نے اپنے طور پر اپنے انداز میں پیش کئے ہیں اس سے مراد کوئی تنقید نہیں ہے بلکہ یہ کہ کوکنیوں کی اردو دانی، علم دوستی اور ادب نوازی پر لکھا جائے تاکہ آنے والی نسل اپنے بزرگوں کی خدمات پر اپنی خوشی کا اظہار کرسکیں اور وہ ان کے نقش قدم پر چل سکیں۔

آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ پچاس سال قبل یعنی ۱۹۴۵ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان شہر بمبئی کے مختار کوکنی خانوادوں کے افراد نے الفنسٹن کالج

(بمبئی) میں گریجویشن کے بعد ڈاکٹر جی ایس گھوریئے جو یونیورسٹی کے سماجیات کے شعبہ کے صدر (۱۹۵۳ ع-۱۹۶۶ ع) تھے انکی نگرانی میں جناب محسن بھائی جی صاحب اور محترمہ زہرہ ڈمٹکر صاحبہ نے پوسٹ گریجویشن کی ڈگری کے لئے مقالے پیش کئے۔ بھائی جی صاحب کے مقالہ کا عنوان «کوکنیوں کی زبان» اور زہرہ ڈمٹکر صاحبہ کے مقالہ کا عنوان «کوکن کے گیت» تھا۔ ان دونوں کے متعلق تفصیل سے لکھا جاسکتا ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوگی اور دوسرا ایڈیشن جلد منظر عام پر آجائیگا۔

المختصر یہ کہ کتابِ مذکور تعریف کی مستحق ہے اور کوکن اردو رائٹرس گلڈز (نیرومی) کی خدمت میں ہمارا ہدیۂ تہنیت پیش ہے اس امید کے ساتھ کہ وہ اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے طباعت کے سلسلے میں ہر ممکن مدد بہم پہنچا کر اس کو قاموس کی شکل دیں۔



Edited by Prof. Nizamuddin S Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director
Anjuman-i-Islam's Urdu Research Institute, Bombay-400 001
Published by Mr Abdul Majeed Patka, B. Com (Hons)
General Secretary
Anjuman-i-Islam, Bombay-400 001 &
Printed by him from Adabi Printing Press
Saboo Siddik Polytechnic, 8, Shepherd Road, Bombay-400 008

قابلِ ذکر لوگ

(مرتبہ اقبال مرزا)

تبصرہ از

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

"قابلِ ذکر لوگ" اطہر راز کے قطعات کا مجموعہ ہے۔ اس میں اُن کے تقریباً چار سو قطعات ہیں لیکن یہ روایتی قطعات کی طرح رومانوی، اخلاقی یا فلسفیانہ نہیں ہیں بلکہ سب کے سب ایسے قطعات ہیں جن کا موضوع شخصیات کی عکاسی ہے اور وہ بھی ایسی شخصیات جو شعر و ادب کی دنیا کے علاوہ زندگی کے اور شعبوں سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور ہندوستان، پاکستان، اسکینڈی نیویا، امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، مشرقِ وسطیٰ اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں رہتے ہیں

اس کا آغاز حمد اور نعت سرور کونین سے ہوا ہے اور پھر امیر خسرو، میر تقی میر، غالب، اقبال، شاہ عبداللطیف بھٹائی، وارث شاہ، میر انیس، سرسید احمد خان اور اس طرح کے دوسرے شاعر، ادیب اور نامور شخصیتوں کو لیا ہے اور ان کی بنیادی خوبیوں کو لے کر ان کی منظوم تصویر کشی کی ہے اور ساتھ ہی ان شخصیتوں کی چھوٹی چھوٹی تصویریں بھی دیدی ہیں جو ان شخصیتوں کو مادی اور معنوی دونوں اعتبار سے حسین اور دلکش بنا کر ہمارے سامنے رکھتی ہیں۔

کہنا چاہئے کہ یہ منظوم منثی بایوگرافیوں کا ایک مجموعہ ہے جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اردو زبان و ادب کے نئے اور پرانے پرستاروں کو شعری پیکروں میں ڈھال کر اُن سے ہمیں متعارف ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اردو میں اپنی نوعیت کی شاید یہ پہلی دلچسپ کوشش ہے جو مؤثر بھی ہے اور معلوماتی بھی۔

ابتدا میں "اطہر راز کے قطعات" کے نام سے اس کے فاضل مرتب اقبال مرزا کا ایک پیش لفظ ہے جس میں انہوں نے اردو زبان کی عالمی مقبولیت پر مختصراً روشنی ڈالنے کے بعد لکھا ہے کہ: "زیر نظر کتاب میں اطہر راز نے الفاظ سے شخصیت کا عکس اتارا ہے اور عکس بھی اُن حضرات کا جن کا علمی یا ادبی مقام ہے جن کی خدمات گراں قدر ہیں"

اس مجموعہ کی ہر نظم، ہر غزل، ہر قطعہ زبان و بیان کی دلکشی و شیرینی کے اعتبار سے بھی اپنا جواب نہیں رکھتا دو ایک نمونے آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

میر تقی میر

شب کی زلفوں کی مہک
آہ سحر رنگ خزاں
فرش پر بکھرے ہوئے
بے جان پتوں کی صدا
یاس میں ڈوبی ہوئی کلیوں کا
آفاقی سرور
شاخِ گل کی تھرتھراہٹ
بے ثباتی کا یقیں
جمع ہیں سب میر کے اشعار میں

راحہ صاحب محمود آباد

دیکھا انھیں تو دل سے یہ آنے لگی صدا
اس دور میں خلوص کی تصویر دیکھ لی
اردو زبان سے ان کی محبت تھی لازوال
دنیا میں ہم نے حاتم کی تفسیر دیکھ لی

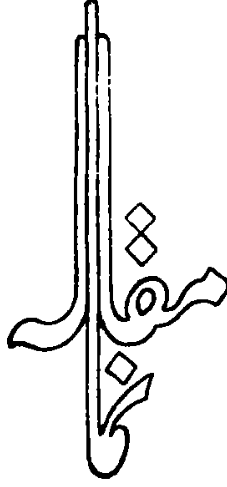
جوش ملیح آبادی

جس کی دولت جام رنگیں جس کا نعرہ انقلاب
چاندنی راتوں کا عاشق جس کا ہمدم ماہتاب
حسنِ فطرت کا مصور ہے یقین کا شکار
جسکے شعروں میں سمٹ آیا ہے فطرت کا شباب

جگر مرادآبادی

بڑا دلکش ہے اندازِ جگر بھی
غزل کی جان ہے سازِ جگر بھی
دلوں کی دھڑکنوں میں گونجتی ہے
غزل میں ڈھل کے آوازِ جگر بھی

● ● ●



اسلامیات

منشی پریم چند

اسلامی تہذیب

(الفرقان لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۹۶، شمارہ ۱۰، ص ۱۹-۲۴)

اسلامی تہذیب کی بنیادی خصوصیات کا ذکر رسول اللہ کی تعلیمات کی روشنی میں۔

ندوی حبیب ریحان

توراۃ اور انجیل کی دو بشارتیں جس کے مصداق محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

(معارف اعظم گڈھ، مارچ ۱۹۹۷، جلد ۱۵۹، شمارہ ۳، ص ۱۶۵-۱۷۹)

یہ مضمون کی دوسری قسط ہے۔ اور اس میں قرآن و حدیث کی روشنی میں حضور پاک کی پیشین گوئیوں کو واضح کیا گیا ہے۔

ندوی توقیر احمد اعظمی

ہندوستان میں عربی سیرت نگاری

(معارف اعظم گڈھ، مارچ ۱۹۹۷، جلد ۱۵۹، شمارہ ۳، ص ۲۰۹-۲۱۶)

ہندوستان کے اُن علماء کے حالات زندگی جنھوں نے عربی میں رسول اللہ کی سیرت پر کام کیا ہے۔

ادبیات

احمد علی شکیل

پھول بن کا تنقیدی جائزہ

(نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۹۶، جلد ۴۶، شمارہ ۲، ص ۵۶-۶۶)

ابن نشاطی کے حالات زندگی اور اس کی مثنوی پھول بن کا ادبی و تنقیدی جائزہ۔

احتر پرویز

حزانۂ رحمت

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ دسمبر ۱۹۹۶ع، جلد ۵۵، شمارہ ۴۸، ص ۸)

ہماری زبان ۸، ۱۵ جنوری ۱۹۹۶ع کے شماروں میں خزانۂ رحمت پر شائع شدہ مضامین اور ان پر چند سوالوں کے جواب۔

اکبر حیدر کشمیری

اقبال کے القاب

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ جنوری ۱۹۹۷ع، جلد ۵، شمارہ ۳، ص ۱)

اقبال کے نام کے ساتھ علامہ کا لقب کب سے لگا ہے۔ اس بحث کی روشنی میں اقبال کے سلوے القاب کا پس منظر پیش کیا گیا ہے۔

غالب کے ایک مکتوب الیہ

سید یوسف مرزا ناصر لکھنؤی

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم جنوری ۱۹۹۷ع، جلد ۵۶، شمارہ ۱، ش ۱)

یوسف مرزا کے خاندانی حالات اور اور اس خاندان سے غالب کے دیرینہ تعلقات کا ذکر۔

غالب کے ایک مکتوب الیہ

سید یوسف مرزا ناصر لکھنؤی

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ جنوری ۱۹۹۷ع، جلد ۵۶، شمارہ ۲، ص ۸)

یوسف مرزا کے حالات زندگی، ان کی ادبی خدمات۔ یوسف مرزا اور مرزا غالب کے درمیان خاندانی مراسم اور دونوں کے باہمی خط و کتابت کا تذکرہ (دوسری قسط)۔

جاوید عالم

وجاہت علی سندیلوی کی یاد میں

(ہماری زبان نئی دہلی۔ یکم جنوری ۱۹۹۷ع، جلد ۵۶، شمارہ ۱، ص ۸)

وجاہت علی سندیلوی کی ادبی و اخلاقی خوبیوں کا تذکرہ، ذاتی مشاہدات کی روشنی میں۔

جین گیان چند

آزادیات کا مطالعہ

(نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۹۶ ع، جلد ۴۶، شمارہ ۲، ص ۱-۱۵)

جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور فن پر شائع شدہ مضامین اور کتابوں کا تعارف. دوسری قسط.

حامدی کاشمیری

پریم چند کے افسانے «کفن» کا تجزیاتی مطالعہ

(شب خون الہ آباد، جنوری ۱۹۹۷ ع، جلد ۳۱، شمارہ ۲۰۲، ص ۶۱-۶۴)

پریم چند کے افسانے «کفن» کا ایک جائزہ.

اقبالیاتی تنقید-ایک جائزہ

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم اکتوبر ۱۹۹۶ ع، جلد ۵۵، شمارہ ۳۷، ص ۱)

اقبال پر جو علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی کام ہوا ہے، اس کی مدد سے اُن کی جامع کمالات شخصیت پر روشنی ڈالی ہے.

حقانی القاسمی

فلسطین کی ممتاز شاعرہ: فدوی طوقان

(برہان دہلی، اگست ۱۹۹۶ ع، جلد ۱۱۹، شمارہ ۸، ص ۲۰-۲۷)

فدوی طوقان عرب دنیا کی ایک ممتاز شاعرہ ہیں ان کے شعری مجموعوں کا تعارف و تبصرہ. (دوسری قسط)

فلسطین کی ممتار شاعرہ فدوی طوقان

(برہان دہلی، ستمبر اکتوبر ۱۹۹۶ ع، جلد ۱۱۹، شمارہ ۹-۱۰، ص ۲۸-۴۰)

فدوی طوقاں کے تعارف پر تیسری قسط.

دسنوی عبدالقوی

«اردو کے چند نامور ادیب اور شاعر» پر ایک نظر

(کتاب نما نئی دہلی، جون ۱۹۹۶ ع، جلد ۳۶، شمارہ ۶، ص ۴۹-۵۸)

حامد اللہ ندوی کی کتاب «اردو کے چند نامور ادیب اور شاعر» کا تنقیدی جائزہ.

پروفیسر سید حامد جعفری مرحوم بھوپال کا ایک محترم شاعر

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ جنوری ۱۹۹۷ ع، جلد ۵۶، شمارہ ۴، ص ۱)

سید حامد جعفری کے حالات زندگی ذاتی تعلقات اور مشاہدات کی روشنی میں۔

رشید الدین

رام لعل ۔ کچھ یادیں

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم دسمبر ۱۹۹۶ع، جلد ۵۵، شمارہ ۴۵، ص ۸۰)

رام لعل کے حالات زندگی ذاتی تعلقات کی روشنی میں۔

سلیمان اطہر جاوید

فراق کا اسلوب شعر

(سب رس حیدرآباد، ستمبر ۱۹۹۶ع، جلد ۵۸، شمارہ ۹، ص ۱۰۔۱۶)

فراق کے شعری اسلوب کا ایک جائزہ۔

سید حسن عباس

پنڈت شیو نارائن شمیم

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ ستمبر ۱۹۹۶ع، جلد ۵۵، شمارہ ۳۶، ص ۲)

شیو نارائن شمیم کے حالات زندگی اور ان کی اردو شاعری کا جائزہ۔

سید سجاد حسین

مستقیم جنگ نامی کی اردو مثنویاں

(نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۹۶ع، جلد ۴۶، شمارہ ۲، ص ۱۶۔۳۰)

نامی آرکاٹی کی اردو مثنویوں کا تفصیلی تعارف۔

مستقیم جنگ نامی کی اردو مثنویاں

(معارف اعظم گڈھ، ستمبر ۱۹۹۶ع، جلد ۱۵۸، شمارہ ۳، ص ۱۹۷۔۲۱۳)

نامی کے حالات زندگی اور ان کی اردو مثنویوں کا تفصیلی تعارف۔

شاداب ذکی بدایونی

بدایون کا ایک قدیم گلدستہ
گلدستۂ بدایون

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم اکتوبر ۱۹۹۶ع، جلد ۵۵، شمارہ ۳۷، ص ۳)

بدایون کی صحافتی تاریخ کی روشنی میں گلدستۂ بدایون کا تعارف۔

شمیم اختر بنارسی

بنارس کا ایک فارسی گو شاعر

(معارف اعظم گڈھ، اکتوبر ۱۹۹۶ع، جلد ۱۵۸، شمارہ ۴، ص ۲۷۱۔۲۷۸)

ملا سالک کے حالات زندگی اور ان کی فارسی شاعری کا جائزہ۔

صاحب علی

برہم کی صحافتی خدمات

(نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۹۶ع، جلد ۴۶، شمارہ ۲، ص ۳۹-۵۵)

عبدالکریم برہم کے حالات زندگی اور ایک صحافی کی حیثیت سے اُن کی خدمات کا تفصیلی تذکرہ۔

جنگ آزادی اور اردو شاعری

(ہندوستانی زبان بمبئی، جنوری-مارچ ۹۶ع، سال ۲، شمارہ ۱، ص ۹-۱۵)

اردو شعرا نے تحریک آزادی میں جان ڈالنے کے لئے اپنی شاعری سے جو تقویت بخشی اس کا تفصیلی جائزہ۔

طیب انصاری

حضرت بندہ نواز اور دکنی ادب

(نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۹۶ع، جلد ۴۶، شمارہ ۲، ص ۳۱-۳۸)

بندہ نواز کے حالات زندگی اور اُن کی تصانیف کا تعارف۔

عبدالاحد ساز

فیض کے ترسیلی خطوط کا تعین۔ نقش فریادی کی نظموں میں

(ہندوستانی زبان بمبئی، جنوری-مارچ ۹۷ع، سال ۲، شمارہ ۱، ص ۱۶-۲۱)

نقش فریادی کی نظموں کی روشنی میں فیض کی شاعری کا جائزہ

عتیق اللہ

آسمان محراب، نقش ہزار رنگ

(کتاب نما نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۶ع، جلد ۳۶، شمارہ ۱۱، ص ۹-۱۵)

شمس الرحمٰن فاروقی کے تازہ مجموعہ کلام "آسمان محراب" کا تعارف۔

فاروقی محبوب الرحمٰن

یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق

(آموزگار جلگاؤں، نومبر-دسمبر ۱۹۹۶ع، جلد ۱۵، شمارہ ۱۱-۱۲، ص ۳-۹)

یونیورسٹیوں میں اردو کے گرتے ہوئے تحقیقی معیار کا جائزہ۔

نگار اُناوی

اردو زبان اور دیو ناگری رسم خط

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ ستمبر ۱۹۹۶ع، جلد ۵۵، شمارہ ۳۴، ص ۲)

اردو کے لئے دیو ناگری رسم خط کو اپنانا کہاں تک درست ہے اس پر رائے۔

قاسمی ابو الکلام (مرتب)

سر سید کی معنویت۔ خاص شمارہ

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ، اکتوبر ۹۶ع)

سر سید کی معنویت پر مختلف ادیبوں اور عالموں کے مضامین۔

قاسمی ابو الکلام

تہذیب، فن اور تنقید

رشید احمد صدیقی

(شب خون الہ آباد، جولائی ۱۹۹۶ع، جلد ۳۱، شمارہ ۱۹۶، ص ۵۳-۵۶)

رشید احمد صدیقی کی ادبی کاوشوں کا جائزہ، تہذیبی پس منظر میں۔

کاظم علی خاں

خاش و خماش پر غالب کی ایک تحریر

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ ستمبر ۱۹۹۶ع، جلد ۵۵، شمارہ ۳۵، ص ۱)

«خاش و خماش» پر غالب کی ایک تحریر اُن کے اردو نثر پاروں میں ملحق ہے۔ اس مضمون میں یہ پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا تعلق غالب کی کس کتاب سے ہے۔

کاظمی رفیع الدین

مطہر کا وطن

(معارف اعظم گڈھ، نومبر ۱۹۹۶ع، جلد ۱۵۸، شمارہ ۵، ص ۳۴۶-۳۵۷)

مطہر فیروز شاہ تغلق کے عہد کا مشہور فارسی شاعر تھا، اس کے وطن اور شاعری کا جائزہ۔

محبوب حسین عباسی

شہاب۔ گجرات کا ایک اردو رسالہ

(معارف اعظم گڈھ، اکتوبر ۱۹۹۶ع، جلد ۱۵۸، شمارہ ۴، ص ۲۷۹-۲۹۴)

بیسویں صدی کے نصف اول میں گجرات سے دو اہم ماہوار رسالے نکلے۔ «زبان» منگرول اور «شہاب» جونا گڈھ۔ شہاب کے اڈیٹر مولانا سید ابو ظفر ندوی اور قاضی احمد میاں اختر جونا گڈھی تھے۔ شہاب کا تفصیلی تعارف۔

محمد علی اثر

ادبی تحقیق کے مسائل دکنی ادب کے حوالے سے

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۶ء، جلد ۵۵، شمارہ ۳۹، ص ۱)

لفظ تحقیق کی وضاحت اور ادبی تحقیق کے ضروری مسائل کا تذکرہ۔

محمد نعمان

علامہ اقبال اور بھرتری ہری

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ نومبر ۱۹۹۶ء، جلد ۵۵، شمارہ ۴۴، ص ۲-۳)

بھرتری ہری کے حالات زندگی اور ان کے ساتھ اقبال کے ذہنی اور فکری روابط پر اظہار خیال

مختار شمیم

ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تنقید نگاری

(کتاب نما نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۶ء، جلد ۳۶، شمارہ ۱۱، ص ۴۱-۴۹)

ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تحقیقی و تنقیدی کتابوں کا جائزہ۔

مصطفیٰ علی خاں فاطمی

حافظ جلیل حسن نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل مانکپوری

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم دسمبر ۱۹۹۶ء، جلد ۵۵، شمارہ ۴۵، ص ۱)

جلیل مانکپوری کے حالات زندگی اور ان کی تصنیفات و تالیفات کا تذکرہ

مظہر امام

فراق اور ان کی شاعری

(آجکل نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۶ء، جلد ۵۵، شمارہ ۴، ص ۱۵-۱۹)

فراق کی شاعری کی بنیاد خصوصیات کا جائزہ

ناظم جعفری

پروین شاکر

(آجکل نئی دہلی، ستمبر ۱۹۹۶ء، جلد ۵۵، شمارہ ۲، ص ۹-۱۷)

پروین شاکر کے حالات زندگی اور اس کی شاعری کا تعارف۔

ندوی ذاکر حسین

امام بخش صہبائی کی تنقید نگاری

(معارف اعظم گڈھ، اکتوبر ۱۹۹۶ء، جلد ۱۵۸، شمارہ ۴، ص ۳۰۲-۳۱۸)

اس مضمون میں صہبائی کے اور کمالات سے قطع نظر صرف اُن کی تنقید نگاری کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

واقف محمد ایوب

ہماری زبان اور ہمارا رسم الخط

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ جنوری ۱۹۹۷ع،
جلد ۵۶. شمارہ ۲، ص ۱-۲)

اردو زبان اور رسم الخط کی اہمیت کا ذکـــر بڑے ادیبوں کے بیانات کی روشنی میں.

ہارون ایوب

اردو ناول نگاری کا تنقیدی سرمایہ

(کتاب نما نئی دہلی، جنوری ۱۹۹۷ع،
جلد ۳۷، شمارہ ۱، ص ۵۶-۶۷)

فن تنقید کی روشنی میں ان کتابوں کا جائزہ جو ناول نگاری کے فن پر وقتاً فوقتاً لکھی گئیں.

شخصیات

اکبر حیدری کشمیری

بیاد ملاذ العلماء سید حسن نقوی مرحوم

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ دسمبر ۱۹۹۶ع،
جلد ۵۵، شمارہ ۴۸، ص ۱)

سید حسن نقوی کے حالات زندگی اور نواب واجـــد علی شاہ سے اُن کے روابط کا ذکر.

ایوب واقف

دنیاے علم کا ایک نامور عالم
قاضی اطہر مبارکپوری

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم اکتوبر ۱۹۹۶ع،
جلد ۵۵، شمارہ ۳۷، ص ۸)

قاضی اطہـــر مبارکپوری کے حالات اور ان کی خدمات کا تذکرہ.

ذو الفقار احمد

شری اروند گھوش - فکر و نظریۂ فوق البشر

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ، اگست ۹۶ع،
جلد ۱۵، شمارہ ۸، ص ۵۲-۵۶)

شری اروند گھوش کے نظریہ فوق البشر کا جائزہ.

رفیعہ شبنم عابدی

غالب اور گاندھی - ایک تقابلی مطالعہ

(ہندستانی زبان بمبئی، اکتـــوبر - دسمبر
۱۹۹۶ع، سال ۱، شمارہ ۱، ص ۱۶-۲۳)

حـالات زنـدگـی، شادی، خـانـدان، اخلاق و عادات، سیاسی نشیب و فراز، دہلی سے تعلق، تعلیمات، فرقہ پرستی کی مخالفت اور بعض دوسری خصوصیات کی روشنی میں دونوں کا مقابلہ کیا ہے.

سید حسن عباس

مولانا آزاد بلگرامی کی فارسی خدمات

(معارف اعظم گڈھ، دسمبر ۱۹۹۶ء، جلد ۵۸، شمارہ ۶، ص ۴۳۹-۴۵۶)

آزاد بلگرامی کے حالات زندگی اور اُن کی تصانیف کا جائزہ۔

مولانا آزاد بلگرامی کی فارسی خدمات

(معارف اعظم گڈھ، جنوری ۱۹۹۷ء، جلد ۱۵۹، شمارہ ۱، ص ۴۶-۵۵)

مضمون کی دوسری قسط۔

شکیل الرحمن

بابا گرونانک۔ جپ جی صاحب

(آجکل نئی دہلی، ستمبر ۱۹۹۶ء، جلد ۵۵، شمارہ ۲، ص ۳-۸)

جپ جی صاحب کا تعارف۔

صدیقی صفی الدین

مارما ڈیوک پکتھال اور ریاست حیدرآباد

(سب رس حیدر آباد، اگست ۱۹۹۶ء، جلد ۵۸، شمارہ ۸، ص ۱۴-۲۰)

پکتھال کے حالات زندگی۔ ان کی تصانیف و تراجم اور حیدرآباد سے ان کے تعلقات کا ذکر۔

ڈاکٹر ظ انصاری: کچھ یادیں کچھ باتیں

(کتاب نما نئی دہلی، جنوری ۱۹۹۷ء، جلد ۳۷، شمارہ ۱، ص ۲۷-۳۴)

ظ انصاری کے حالات زندگی ذاتی مشاہدات کی روشنی میں

ظہیر علی صدیقی

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۸ دسمبر ۱۹۹۶ء، جلد ۵۵، شمارہ ۳۵، ص ۸)

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے حالات زندگی

عرفان احمد

ابن الہیثم۔ ایک جدت پسند سائنس داں

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ، جنوری ۹۷ء، جلد ۱۶، شمارہ ۱، ص ۴۱-۴۴)

ابن الہیثم کے حالات زندگی

گیان چند جین

پرکاش مونس۔ میرے بھائی

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ اکتوبر ۱۹۹۶ء، جلد ۵۵، شمارہ ۳۸، ص ۱)

پرکاش مونس، گیان چند جین کے بڑے بھائی تھے، اور جین کی تعلیم و تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ تھا، ان کی شخصیت اور شاعری کا ذکر۔

محمد زکریا درک

پرنس آف فزیشن۔ ابو علی سینا

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ۔ جنوری ۹۷ء، جلد ۱۹، شمارہ ۱، ص ۲۹۔۴۰)

ابو علی سینا کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کا تذکرہ۔

نامی انصاری

دلیپ سنگھ۔ بزم گل کا مزاج داں نہ رہا

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ اکتوبر ۱۹۹۶ء، جلد ۵۵، شمارہ ۳۸، ص ۳)

دلیپ سنگھ اردو کے اچھے مزاح نگار تھے، قومی آواز میں ان کا مزاحیہ کالم ہوتا تھا، گل گفت اس کا عنوان تھا

ندوی محسن عثمانی

کمال علی کمال عظیم آبادی دیوروی

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ اکتوبر ۱۹۹۶ء، جلد ۵۵، شمارہ ۳۸، ص ۲)

کمال عظیم آبادی کے حالات زندگی اور اُن کی اردو اور فارسی شاعری کا تذکرہ

یونس اگاسکر

گاندھی جی اور اکبر الہ آبادی

(ہندستانی زبان بمبئی، اکتوبر۔دسمبر ۹۶ء، سال ۱، شمارہ ۱، ص ۱۲۔۱۵)

اکبر الہ آبادی نے اپنی بات کہنے اور اس کو موثر بنانے کے لئے جو چند مخصوص کردار چن لئے تھے ان میں ایک گاندھی بھی تھا نقادوں کی مدد سے اس کردار کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

متفرقات

بشمبر ناتھ پانڈے، مترجم محمد نوشاد عالم

تاریخ کے ساتھ یہ ناانصافی کیوں

(برہان دہلی، ستمبر اکتوبر ۱۹۹۶ء، جلد ۱۱۹، شمارہ ۹۔۱۰، ص ۱۷۔۲۶)

بشمبر ناتھ پانڈے کی تقریروں اور مقالوں کا تذکرہ جن میں انہوں نے اورنگ زیب اور بعض دوسرے مسلم سلاطین کے خلاف انگریزوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں پر تنقید کی ہے۔

ظہیر علی صدیقی

تاریخ کتب خانہ واحد، مخطوطہ

(کتاب نما نئی دہلی، جون ۱۹۹۶ء، جلد ۳۶، شمارہ ۶، ص ۳۳۔۳۶)

حافظ احمد علی شوق کے مخطوطے

«تاریخ کتب خانۂ عالیہ دار الریاست مصطفیٰ آباد عرف رام پور» کا تعارف۔

عبد الغنی شیخ

دنیا کے چند مشہور ترین ناول

(آجکل نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۶ع، جلد ۵۵، شمارہ ۴، ص ۳-۶)

انگریزی، فرنچ، روسی اور دوسری زبانوں میں لکھے ہوئے ایسے ۱۵ ناولوں کا تعارف جو دنیا بھر میں مشہور ہوئے۔

عبد القادر

ایڈس

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ، دسمبر ۹۶ع، جلد ۱۵، شمارہ ۱۲، ص ۴۱-۵۷)

ایڈس کی بیماری پر تفصیلی معلومات۔

عرفان احمد

پروفیسر آئن سٹائن اور ان کا نظریۂ اضافیت

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ، نومبر ۱۹۹۶ع، جلد ۱۵، شمارہ ۱۱، ص ۳۱-۳۶)

نظریۂ اضافیت کی سائنسی وضاحت۔

فاروقی شمس الرحمٰن

بنارس میں فارسی زبان و ادب کے دو قیمتی آثار

(کتاب نما نئی دہلی، جون ۱۹۹۶ع، جلد ۳۶، شمارہ ۶، ص ۷-۱۳)

غالب کی فارسی مثنوی چراغ دیر اور ملا محمد عمر سابق کے خانوادہ کی دین فرہنگ اشد راج کا تنقیدی جائزہ، بنارس میں فارسی زبان و ادب کے دو قیمتی آثار۔

قاسمی عتیق احمد

فری میسن

(الفرقان لکھنؤ، جنوری ۱۹۹۷ع، جلد ۶۵، شمارہ ۱، ص ۲۸-۳۸)

فری میسن نام کی ایک یہودی تحریک کا تعارف، جس کا واحد مقصد دنیا میں یہودیت پھیلانا اور دوسرے مذاہب کے خلاف سازشیں کرنا تھا۔

محمد نعمان خان

وگ کی وضاحت

(معارف اعظم گڈھ، جنوری ۱۹۹۷ع، جلد ۱۸۹، شمارہ ۱، ص ۵۶-۶۲)

وِگ (Wig) کی وضاحت اور اسلامی نقطۂ نظر سے اس کے استعمال کا مسئلہ۔

ندوی سرور عالم

عرب اور فن تحریر کا عروج و ارتقاء

(معارف اعظم گڈھ، اکتوبر ۱۹۹۶ع، جلد ۱۵۸، شمارہ ۴، ص ۲۹۵-۳۰۱)

عہد قدیم میں سمیری، مصری، عکادی فینقی اور بعض دوسری عرب قوموں نے جو رسم الخط ایجاد کیا اس کا تحریری و تاریخی جائزہ۔

● ● ●

مطبوعات و تالیفات

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی

- لغات گجری (مرتبہ)
- رقعات عالمگیر (مرتبہ)
- مقدمۂ رقعات عالمگیر (مولفہ)
- تاریخ ادب عربی (ترجمہ)
- برطانوی ہند کا نظام سیاسی (ترجمہ)
- سوراج (ترجمہ)
- رہنماے صحت (ترجمہ)
- ترک موالات دوسرے ممالک میں (ترجمہ)

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

- ولی گجراتی (مولفہ)
- نورالمعرفت (مرتبہ)
- غزل ولی تک (مولفہ)
- اردو ایسیز (مرتبہ)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

- اردو مراٹھی شبد کوش (مرتبہ)
- نواے وقت (مولفہ)
- گلمپسیز آف اردو لٹریچر (مصنفہ)
- طوطیان ہند (مرتبہ)
- انڈوایران ریلیشنز: کلچرل اسپیکٹس (مصنفہ)
- انجمن اسلام صد سالہ تقریبات کی روداد (مرتبہ)
- مہاراشٹرہ میں اردو کا مقام (مرتبہ)
- اردو الفابیٹ اِن ٹو دیوناگری لپی (مصنفہ)

جناب عبدالرزاق قریشی

- نواے آزادی (مرتبہ)
- مرزا مظہر جان جاناں (مولفہ)
- مکاتیب مرزا مظہر (مرتبہ)
- مبادیات تحقیق (مولفہ)
- راگ مالا (مولفہ)

نقطے اور شوشے مصنفہ ڈاکٹر عابد پشاوری

مخطوطات جامع مسجد بمبئی مرتبہ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

مقالہ نما مرتبہ محترمہ رقیہ انعامدار

نوائے ادب ، بمبئی

FORM : IV - ROLL NO : VIII

Registration No. 32009/50 — رجسٹریشن نمبر ۳۲۰۰۹/۵۰

مقام اشاعت	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نوعیت اشاعت	ششماہی
نام پرنٹر	جناب عبدالمجید پالکا، بی کام (آنرز)
قومیت	ہندوستانی
پتہ	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نام پبلشر قومیت پتہ	ایضاً
نام ایڈیٹر	پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ
قومیت	ہندوستانی
پتہ	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نام پتہ مالک رسالہ	ایضاً

میں عبدالمجید پالکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

عبدالمجید پالکا

• • •

All remittances be sent & correspondence be made to
Prof. N. S. Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director
Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute
92 Dadabhoy Nowroji Road, Mumbai-400 001

•

ANNUAL SUBSCRIPTION

Inland : Rs. fifty • *Foreign . £ 10*

نوائے ادب بمبئی

ششماہی

•

مدیر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

•

جلد ۴۷ — شمارہ ۲

اکتوبر، ۱۹۹۷ ع

•

مندرجات

مودبانہ التمــاس

قلمکاروں سے استدعا ہے کہ وہ اپنے

مضامین یا مقالے

نوائے ادب

میں بغرض اشاعت ارسال فرمائیں

مدیروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے

رسائل و جرائد

مقــالہ نما

میں شمولیت کی غرض سے بھیجیں

ناشروں سے اپیل ہے کہ وہ اپنی

تصانیف و تالیفات

کتــابی دنیا

میں برائے تبصرہ ارسال کریں اور

اردو دوستوں سے گذارش ہے کہ وہ اپنا

سالانہ چنــدہ

بھیجکر

نوائے ادب

کی سرپرستی قبول فرما کر شکریہ کا موقع عنایت کریں

(پروفیسر) نظــام الدین ایس گوریکر
(مدیر)

احوال واقعی

انسٹی ٹیوٹ کی مختصر روداد :

مقام مسرت ہے کہ پچاس سال پہلے یعنی جہاں ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کو آزادی ملی وہاں اسی تاریخی سال میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (عمبئ) کا قیام بھی عمل میں آیا اور آج بفضل ایزدی انسٹی ٹیوٹ نے اپنی زندگی کے پچاس سال پورے کئے اور اکاونویں سال میں قدم رکھا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے ترجمان ''نوائے ادب'' کے سال رواں کے پہلے شمارے (اپریل ۱۹۹۷ء) کو ''اُردو'' کے نام سے منسوب کیا اور جریدہ کو ''اُردو نمبر'' نام دیا جس میں گذشتہ پچاس سال کی کارگذاریوں کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔ سچ ہے کہ مالی مشکلات کے باوجود اس تحقیقاتی ادارے نے جنوبی ہند میں اردو کے کاز کو آگے بڑھانے کے لئے ہر ممکنہ کوششیں کیں اور تاحال نو طالب علموں کو اردو ڈاکٹریٹ سے نوازا اور کوئی پینتالیس سال سے اپنے تحقیقی جریدہ ''نوائے ادب'' کو جاری رکھا ہے اور معیار کے لحاظ سے اور ادبی اعتبار سے اس جریدہ کو نہ صرف ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں پسند کیا جاتا ہے بلکہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی یہ جریدہ کافی مقبول ہے۔ علاوہ ازیں اس ادارے کے زیر اہتمام سلسلۂ تقاریر اور مجالس مذاکرہ کا بھی اہتمام کیا گیا اور جارہا ہے جس کے لئے انجمن اسلام کے صدر محترم ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب کی فعّال شخصیت قابل صد ستائش ہے کیونکہ انہوں نے ہر ممکن طریقے سے انسٹی ٹیوٹ کے لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنانے میں ہر ممکن طریقے سے مالی تعاون سے دریغ نہیں کیا بعینہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، دہلی کے زیر سرپرستی خطاطی کا مرکز کی نیو ۱۹۷۵ء میں ڈالی گئی جب ڈاکٹر گوریکر صاحب نے ناظم کی حیثیت سے چارج لیا تھا۔ اس خطاطی مرکز میں طلبا اور طالبات خطاطی کے فن سے واقف کار ہورہے ہیں اور سینکڑوں طالب علموں نے کامیابی کے بعد اس فن کے ذریعے اپنے لئے روزگار کی راہ بھی نکالی۔ خوشی کی بات ہے کہ کامیاب شدہ طلبہ بیرونی ممالک میں بھی جہاں خطاطی کا فن آج بھی زندہ ہے، برسر روزگار ہیں۔

بیرونی ممالک کے اہل قلم کی تشریف آوری :

ٹوکیو یونیورسٹی آف پرشین اسٹڈیز ، نو شوگاہارا ، ٹوکیو (جاپان) کے شعبۂ اردو کے پروفیسر کین ساکو ماتیا صاحب نے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر گوربکر صاحب سے ملاقات کی ۔ ڈائرکٹر صاحب نے انہیں انسٹی ٹیوٹ کی کارگذاریوں کی جانکاری دی اور لائبریری کے تعلق سے معلومات بہم پہنچائی بڑے خوش ہوئے اور کہا کہ جب کبھی میں ہندوستان آؤنگا تو بمبئی میں انسٹی ٹیوٹ کے دفتر میں حاضری دونگا اسی طرح ماہر معاشیات ڈاکٹر محمد قاسم داوی صاحب ، جنہوں نے لندن میں ایک مدت تک اقوام متحدہ اور حکومت ہند کے مشیر کی حیثیت سے خدمات انجام دی ہیں اور حال لندن میں مقیم ہیں ۔ انسٹی ٹیوٹ میں تشریف لائے اور ادارہ کی مقاصد کے حصولیابی کی غرض سے ڈاکٹر گوربکر صاحب سے گفتگو شروع کی اور ایک بڑی رقم دینے کے تعلق سے اپنا عندیہ بیان کیا گوربکر صاحب نے خوشی کا اظہار کیا اور وہ انہیں اپنے ساتھ صدر انجمن اسلام ڈاکٹر مخدوم والا صاحب کے پاس لے گئے اور ڈاکٹر داوی صاحب نے فنڈ کی غرض سے عرضداشت پیش کی جو صاحب صدر نے بخوشی قبول کی اور فرمایا کہ مصطفیٰ بقیہ فنڈ کو قبول کیا جائیگا ۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی ، برکلے (کیلیفورنیا) کے شعبۂ انگریزی کی پروفیسر (محترمہ) پریا جوشی صاحبہ نے کریمی لائبریری کے تعلق سے معلومات فراہم کرنے کی غرض سے گوربکر صاحب سے ملاقات کی اور اپنے منصوبہ کے بارے میں اظہار خیال کیا ۔

ڈاکٹر ایس ایس گوربکر صاحب نے ان تمام اہل علم اردو دوستوں کی خدمت میں «نوائے ادب» کے علاوہ «طوطیان ہند» اور «اردو الفابیٹ ان ٹو دیوناگری لپی» کے نسخے پیش کئے اور چائے سے تواضع کی ۔

ڈاکٹر نجم الدین یادگار تقریر ۔

ماہر اقبالیات اور جموں یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ایمیریٹس (Professor Emeritus) ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد نے بزبان انگریزی ڈاکٹر اقبال جیسے ممتاز شاعر کے بارے میں اظہار خیال کیا اور فرمایا کہ ڈاکٹر اقبال ایک بہت بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ بڑے فلسفی بھی تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ہندوستان

دوست تھے۔ صدارت ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب نے فرمائی اور اپنی صدارتی تقریر میں اردو، ہندوستان اور ڈاکٹر اقبال کے بارے میں اظہار خیال کیا اور جگن ناتھ آزاد کا شکریہ ادا کیا کہ وہ ہماری دعوت پر تشریف لائے اور بڑی پر مغز تقریر کی دعوتِ طہرانہ کے بعد جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

مصطفیٰ فقیہ فنڈ :

دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے ہیں اور اس طرح انسٹی ٹیوٹ کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے بین الاقوامی شہرت کے مالک محترم ڈاکٹر قاسم داوی صاحب نے اپنے عزیز بزرگ اور انکی نصف بہتر کے والد بزرگوار عالیجناب مصطفیٰ فقیہ صاحب کی یاد میں انسٹی ٹیوٹ کی خاطر صدر ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب کی خدمت میں ساڑھے تین لاکھ روپے کی خطیر رقم پیش کی اور گذارش کی کہ (۱) ہر سال مصطفیٰ فقیہ یادگار سلسلۂ تقاریر یا مجلس مذاکرہ منعقد کئے جائیں اور ان کی روداد تفصیل سے شائع کی جائیں، (۲) ایک سال کے لئے ریسرچ افسر کا تقرر کیا جائے اور انہیں وظیفہ دیا جائے اور اگر ان کا تحقیقی کام خاطر خواہ ہے تو دو سے تین سال تک ایک پروجیکٹ دیکر رکھا جائے اور ہوسکے تو اردو کے کار کی خاطر مالی امداد بھی دینے سے گریز نہ کیا جائے

ڈائریکٹر کی کتاب کی اشاعت :

انجمن اسلام (بمبئی) نے ڈاکٹر نظام الدین ایس. گوریکر کی کتاب «اردو الفابیٹ اینڈ دیوناگری لیپی» کو شائع کرکے اردو اور ہندی کے رشتہ کو اور استوار کیا ہے. ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب نے مقدمہ تحریر کیا ہے اور پروفیسر عزکیل. معتمد انڈین پی ای این سینٹر (بمبئی) نے تعارف لکھا ہے دراصل یہ کتاب اردو اور ہندی کو قریب لانے میں ممد و معاون ثابت ہوگی اور اردو کے حروف تہجی جو عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے حروف کا مجموعہ ہیں ان کو سائنسی اور لسانی اعتبار سے ناگری حروف میں ترجمانی کرنے کی بڑی کوشش کی ہے۔ اور

اس طرح اردو دوست جو اردو حروف سے نابلد ہیں اردو زبان و ادب کی ہر صنف سے روشناس ہوجائینگے اور مہاتما گاندھی جی کا خواب کہ شرمندۂ تعبیر ہوگا ہندوستان کی قومی زبان یعنی راشٹرہ بھاشا نہ ہندی کے نام سے پکاری جائے نہ اردو کے نام سے بلکہ ہندوستانی کے نام سے یاد کی جائے جو اور دونوں خطوں میں لکھی جائے کیونکہ ہندوستان کی عام زبانیں بالعموم ناگری حروف میں لکھی جاتی ہیں اور مغربی ایشیا اور مشرقی ایشیا کی زبانیں عربی حروف میں عام طور پر لکھی جاتی ہیں اور در حقیقت یہ ہندوستانی زبان ایشیا میں قومی یک جہتی کا ذریعہ اور مشترکہ ثقافت کی علمبردار ہے۔

اردو اکادمیوں سے مخلصانہ گذارش

ہماری مخلصانہ اپیل ہے اردو اکادمیوں کے سربراہوں سے کہ وہ
اس جریدہ کی خریداری قبول فرمائیں اور اپنی جانب سے
اس رسالہ کو تعلیمی اور ادبی اداروں میں پہنچانے میں
ہمارا تعاون فرمائیں کیونکہ ہمارا یہ تحقیقی جریدہ
جو انسٹی ٹیوٹ کا ترجمان ہے، تجارتی جریدہ نہیں
بلکہ محض ادبی ہے۔ دہلی اردو اکادمی اور
کرناٹک اردو اکادمی اسکی سرپرستی کررہے
ہیں مہاراشٹرہ اردو اکادمی بھی سرپرستی
کررہی تھی اب نہ معلوم اس نے
کس بنا پر اس کی خریداری کو
موقوف کیا ہے
اگرچہ ہم نے زبان کے ناطے درخواست
کی ہے کہ وہ اس طرف توجہ کرے
اور خریداری کو بحال کرے

— نظام الدین ایس گوریکر
(مدیر)

عہد آصفیہ میں اُردو ناول کا ارتقا

از

پروفیسر محمد طیب انصاری، ایوان شاہی، گلبرگہ

اُردو میں ناول نگاری کی ابتـــداء کا سہرا مولوی نذیر احمد کے سر باندھا جاتا ہے۔ اصناف ادب اُردو کے مورخین نے لکھا ہے "چنانچہ اسی زمانہ میں ان کے ہاتھوں ناول کا آغاز ہوا۔ اور ۱۸۶۹ ع میں انھوں نے اپنا پہـــلا ناول مراۃ العروس لکھا۔ "[1] احتشام حسین، نذیر احمد اور سرشار کے تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں:

"جس دور کا تذکرہ کیا جارہا ہے اس میں اُردو ناول نے بھی بڑی ترقی کی تھی مولانا نذیر احمد کے ناولوں کا بیان ہوچکا ہے اور ان کو پہلا ناول نگار کہا بھی جاتا ہے مگر حقیقت میں رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر نے اردو ناولوں کو انگریزی فن ناول نگاری کی نظر سے دیکھا۔"[2]

ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے کہ نذیر احمد پہلے ناول نگار ہیں لیکن ان کے قول کے مطابق "ناول کے یہ اولین نمونے جو نذیر احمـــد کے قصوں کی شکل میں وجود میں آئے فن کے اعلیٰ معیار پر پورے نہیں اترتے اور ان میں وہ بنیادی اوصافؔ نہیں ملتے جو ناول کے اجزائے ترکیبی کہے جاتے ہیں۔"[3] ان دو ناقدین کا یہ جو معیار ہے وہ اصل میں وہی انگریزی ادب ہی کا عطا کردہ ہے جس کی بنیاد پر احتشام حسین نے بھی رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر کو ناول نگار تسلیم کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اصل میں ناول کہانی ہی کا انگریزی نام ہے ہمیں اس چکر میں پڑھے بغیر ادب کے تدریجی اور فطری ارتقاء کی روشنی میں کہانی (ناول) کا تنقیدی جائزہ لینا چاہئے۔ البتہ ناول کی تقسیم ترجمہ اور تخلیق کی بنیاد پر کی جاسکتی ہے۔ ایک ناول وہ ہیں جو سنسکرت عربی، فارسی، فرانسیسی، چینی، جاپانی، روسی اور انگریزی زبانوں سے لئے گئے ہیں دوسرے وہ جو تخلیقی اور طبع زاد ہیں۔ اگر ہم اس بنیادی حقیقت کو تسلیم کرلیں تو ملا وجہـــی کے بعد یہاں دکن میں بعہد ناصر الـــدولہ اُردو کے دو

کہانی کاروں کے نام ملتے ہیں۔ جو تاریخی لحاظ سے مولوی نذیر احمد اور سرشار کے پیش رو ہیں۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے لکھا ہے:

«اس کے علاوہ کچھ قصے بھی اسی زمانے میں لکھے گئے تھے ان قصوں میں مرغوب الطبع، چار درویش، ہمیشہ بہار، گل صنوبر اور تناولی قابل ذکر ہیں»[۴] وہ مزید لکھتی ہیں «تناولی» بکاولی کے قصے اور نہال چند لاہوری کے مذہب عشق پر مبنی ہے اس کے مصنف فقیر اللہ شاہ حیدر ہیں «چندو لعل کے معاصرین میں فقیر اللہ شاہ حیدر بھی قابل ذکر ہیں، حیدر حافظ شجاع الدین کے مرید اور اُردو کے اچھے ادیب اور شاعر تھے»[۵] تناولی ۱۲۴۴ھ میں لکھی گئی۔

«مرغوب الطبع» مشہور فارسی قصہ «کامروپ» کا ترجمہ ہے۔ اس کے مصنف سید حسین علی خان حیدر آباد کے ایک جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے دو اور قصوں چار درویش اور بہار درویش کا بھی اُردو ترجمہ کیا تھا موخر الذکر کا ترجمہ «ہمیشہ بہار» کے نام سے موسوم ہے جس کی تکمیل ۱۲۵۰ھ میں ہوئی تھی مرغوب الطبع ۱۲۴۸ھ میں مکمل ہوئی»[۶]

یہ صحیح ہے کہ سید حسین علی خان اور فقیر اللہ شاہ کے قصے طبع نہیں ہوئے اس لئے تاریخ ادب میں ان کا ذکر نہیں ملتا مگر نذیر احمد اور سرشار دونوں ہی حضرات جب حیدر آباد آئے تھے اس وقت ناول نگاری کا رجحان حیدر آباد میں موجود تھا۔ اور اس زمانہ میں حیدر آباد کے رسائل اُردو ناول بالاقساط شائع کررہے تھے۔ نذیر احمد کے حیدر آباد (۱۸۷۷ع) آنے سے یقیناً اس صنف ادب کی طرف اُن کا رجحان اور بھی بڑھا ہوگا کیونکہ اس وقت تک ان کا پہلا ناول مراۃ العروس ۱۸۶۹ع میں شائع ہوچکا تھا اور ان کے دوسرے ناول توبتہ النصوح، بنات النعش، رویائے صادقہ، محسنات اور ابن الوقت وغیرہ ادبی حلقوں میں مقبولیت عام کا شرف حاصل کرچکے تھے۔ ۱۸۹۷ع میں رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر حیدر آباد آئے۔ اس دور کے اُردو ناول نگاروں میں مہاراجہ سرکشن پرشاد، محب حسین، محمد سلطان عاقل، محمد علی بشیر، لطف علی خان سہیل اور ظفر علی خان نے نام کمایا تھا اور یہ زمانہ انیسویں صدی کے دو آخری دہوں کا زمانہ تھا۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد کی شخصیت اور نظم و نثر پر مثل ہما سایہ فگن نظر آتی ہے۔ شاعری کا شوق ہوا تو نظم، غزل، قصیدہ، مثنوی، مسدس، مرثیہ، رباعی اور قطعہ سب کچھ لکھ ڈالا اور نثر لکھنے پر اُتر آے تو مقالات و مضامین لکھے، ناول اور سفر نامے لکھے، خطوط و خطبات لکھے اور تمہیدات و تقریظات بھی۔ وہ خود شاعر تھے اور شعرا کے سرپرست بھی، وہ نثار تھے اور نثر نگاروں کا حلقہ ان کے گرد گھومتا تھا اور انہوں نے صحافتی خدمات بھی انجام دیئے ہیں۔

مہاراجہ کی افسانہ نگاری کے بارے میں ڈاکٹر حبیب ضیاء لکھتی ہیں:

« مہاراجہ نے افسانہ نگاری اردو ناولوں میں تاریخی مواد کا استعمال شرر سے سیکھا ان کے ناولوں میں اخلاقی نقطۂ نظر کی اہمیت بھی شرر اور نذیر احمد کا اثر ہے مہاراجہ نے تہذیب کی عکاسی روزمرہ اور محاورہ کا لطف اور بولی ٹھولی کا چٹخارہ سرشار سے سیکھا۔ ان کے یہاں بھی ان کے پیشرو ناول نگاروں کی طرح حسن و عشق کا روایتی تصور ملتا ہے۔ ان کے کرداروں میں بھی شرر کے کرداروں کی طرح کوئی ارتقاء پذیری نہیں ملتی۔ »[۷]

ڈاکٹر حبیب ضیاء نے مہاراجہ کے تین ناول کا ذکر کیا ہے۔ (۱) مطلع خورشید (۲) چنچل نار اور (۳) بزم خیال ان تینوں ناولوں کے علاوہ انہوں نے دو اور ناولوں کے بارے میں بھی تفصیلات دی ہیں۔ البتہ سرمایۂ سعادت کا سن تصنیف انہوں نے نہیں بتایا ہے جبکہ مہاراجہ کا پانچواں ناول فسانہ شیدا عدم دستیاب ہے۔ چونکہ سرمایۂ سعادت کا سن تصنیف انہیں معلوم نہ تھا اس لئے انہوں نے اس کا ذکر مطلع خورشید، چنچل نار اور بزم خیال کے بعد کیا ہے حالانکہ سرمایۂ سعادت مہاراجہ کا وہ ناول ہے جو ۱۳۰۵ھ ـ ۱۸۸۷ع میں لکھا گیا جبکہ مطلع خورشید (۱۳۱۵ھ ـ ۱۸۹۷ع) چنچل نار (۱۳۲۱ھ ـ ۱۹۰۳ع) اور بزم خیال (تین حصے) (۱۳۲۷ھ ـ ۱۹۰۹ع) میں شائع ہوئے۔

سرمایۂ سعادت کے بارے میں مہاراجہ نے لکھا ہے کہ « یہ پہلی کتاب ہے جو میں اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں چھپوا کر ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ یہ ایک چھوٹا سا

قصہ ہے جس میں نہ عبارت آرائی ہے نہ زیادہ اشعار درج ہیں۔ »[۸]

ڈاکٹر حبیب نے سرمایۂ سعادت پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں حشمت، رضوی، نفیس، عشرت اور منشی امیر حمزہ کے قطعات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے «ان سب قطعات سے ۱۳۰۵ھ تاریخ مادہ نکلتی ہے تو پھر انھوں نے یہ کیسے لکھدیا کہ سن تصنیف اور سن طباعت کا پتہ نہیں چلتا۔ جملہ کی کتابت بتاتی ہے کہ ان قطعات کا علم انہیں طباعت مقالہ کے دوران میں ہوا۔ ورنہ وہ ابتداء میں ہوا۔ ورنہ وہ ابتداء میں تصحیح کردیتیں۔ بہر حال سن تصنیف اور خود مہاراجہ کے قول سے ثابت ہے کہ سرمایۂ سعادت مہاراجہ کا پہلا ناول ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ یہ پہلا ناول حقیقت نگاری اور واقعہ نگاری کے اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔

سرمایۂ سعادت کا ماحول حیدرآبادی، اس کے کردار حیدرآبادی اور واقعات بھی حیدرآبادی سماج ہی سے متعلق ہیں۔

مطلع خورشید مہاراجہ کا دوسرا ناول ہے اور حضرت داغ دہلوی نے اس ناول پر «داد سخن» دی ہے۔ اور تاریخی قطعہ میں کمال کر دکھایا ہے۔ مطلع خورشید کا کیا خوب فائدہ اٹھایا ہے ملاحظہ ہو ؎

نام اس کا ہے «مطلع خورشید»
اس کی تاریخ تھی یہی زیبا
داغ نے یہ کہا ہے مصرعہ سال
آفتاب سخن بھی اب نکلا (۱۳۱۵ھ)

ناول بارہ ابواب میں منقسم ہے۔ خورشید آرا اور مرزا غضنفر کی کہانی حیدرآبادی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ ماحول حیدرآباد ہی کا ہے اور مناظر بھی حیدرآباد کے۔ حیدرآباد میں جو امن و اماں تھا اور جو بے خوفی تھی اس کا اظہار بھی مہاراجہ نے اپنے اس ناول میں کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ وہ اپنے کردار سے کہلواتے ہیں :

«اے بہن کیا شہر شملہ ہے۔ یہ بھی کوئی دلگی ہے۔ سید محبوب علی خان

بہادر کا راج ہے۔ شیر کی عملداری۔ جنگل میں اندھیری رات کو سونا اچھالتے جاو تو ڈر نہیں۔"

چنچل نار مہاراجہ کا تیسرا ناول ہے جو ۱۹۰۳ ع میں شائع ہوا۔ اس ناول کی اشاعت سے قبل ہی رتن ناتھ سرشار کا تعلق حیدرآباد سے قائم ہوکر ٹوٹ چکا تھا۔ وہ مہاراجہ کے متوسلین میں سے تھے، ۱۳۱۵ ھ۔۱۸۹۷ ع میں وہ حیدرآباد آے اور "دبدبہ آصفی" کی ادارت انہوں نے سنبھالی دبدبہ آصفی میں چنچل نار کی چند قسطیں شائع ہوئی تھیں۔ بعد میں یہی ناول کتابی صورت میں منظر عام پر آیا۔ چنچل نار شاد کا متنازعہ ناول ہے۔ عام طور پر مشہور تھا کہ اس کے مصنف شاد نہیں بلکہ سرشار ہیں۔ اس کی وجہ تو یہ تھی کہ سرشار معروف ناول نگار تھے اور ان کا ناول فسانۂ آزاد مقبول ہوچکا تھا۔ اور وہ اس وقت جبکہ چنچل نار کی اشاعت عمل میں آرہی تھی حیدرآباد ہی میں اس رسالہ کی ادارت کا کام انجام دے رہے تھے۔ ویسے بھی عام طور پر امراء اور وزراء کی علمی اور ادبی کاوشوں کو حیدرآباد ہی پر کیا منحصر ہے ہندوستان بھر میں شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر کی شاعری کو اکثر ذوق کی مشق سخن کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔ شمس الامراء کی تصانیف کو ان کی اپنی تسلیم نہیں کیا جاتا، میر محبوب علی خان آصف اور میر عثمان علی خان عثمان کی شاعرانہ صلاحیتیں بھی مشتبہ رہی ہیں اب اس الزام سے بیچارے شاد بھلا کیسے بچ سکتے تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر حبیب ضیاء نے لکھا ہے ڈاکٹر قمر رئیس نے چنچل نار کو اسکی محاوراتی اور بیگماتی زبان، انداز بیان کی شوخی اور شگفتگی، واقعات میں ظرافت اور ٹکنک کے پیش نظر سرشار کا ناول بتایا ہے۔[9] اور حکم چند نیر نے داخلی شواہد کی اس دلیل کو رد کرتے ہوئے لکھا کہ "مہاراجہ شاد، پنڈت سرشار کے شاگرد تھے۔" اس لئے شاد نے اپنے استاد کی پیروی کی ہے۔ سرشار استاد تو خیر تھے نہیں شاد کے نوکر تھے اور دبدبہ میں اجرت پر کام کرتے تھے۔

"۱۳۱۵ ھ میں ایک رسالہ دبدبۂ آصفی نام جاری کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ سرشار مرحوم میرے پاس ملازم ہوچکے تھے۔"[10]

ہاں! یہ صحیح ہے کہ شاد سرشار کے ناول فسانۂ آزاد سے متاثر تھے اور ان کے دل میں سرشار کی بڑی عزت تھی۔ چنانچہ اس تاثر کے پیش نظر انہوں نے دبدبہ کے لئے ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ شاد نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے وہ فسانہ کے اسلوب، طرز تحریر، فقرہ بازی، محاوروں اور بے ساختہ پن سے متاثر تھے۔ لیکن اپنی زبان اور بیان پر انہیں اعتماد بھی تھا اس سلسلہ میں دو باتیں ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ شاد بے شعوری طور پر فسانۂ آزاد کی زبان، محاورے اور اسلوب کو چنچل نار میں برتا ہے دوسری بات یہ ہوسکتی ہے کہ سرشار نے دبدبہ آصفی میں اس ناول کی اشاعت سے پہلے تصحیح کردی تھی۔ لیکن یہ کہنا کہ یہ ناول قطعی طور پر مہاراجہ شاد کا نہیں ہے یہ بات غیر ذمہ دارانہ تحقیق پر دلالت کرتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرشار نے چنچل نار لکھدیا مگر سرمایۂ سعادت، مطلع خورشید اور بزم خیال کس نے لکھا اور پھر ان کے خطوط، تقریظات، خطبات اور سفر ناموں کا کیا ہوگا؟ مہاراجہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے اور خوب لکھتے تھے وہ اپنی تحریر کے بارے میں ایک خط میں سرشار سے پوچھتے ہیں۔

«آپ کو دعوی تھا کہ لکھنؤ کے مقابل میں اور خصوصاً سرشار کے مقابلے میں کوئی نثر نگار نہیں لکھ سکے گا۔ مگر اب بھی کچھ مانوگے کہ نہیں کہ ہم حیدرآبادی بھی لکھ لیتے ہیں۔»

وہ اپنی نثر نگاری کے بارے میں کہتے ہیں۔

«یہ میں نے مانا کہ میں منشی نہیں ہوں۔ انشا پردازی مجھے نہیں آتی۔ اور نہ مجھے ابو الفضل یا نعمت خان عالی ہونے کا دعوی ہے۔ مگر ہاں مرزا علی بابا شیرازی الاصل کا شاگرد ہوں۔ سیدھی سادھی نثر لکھتا ہوں۔ مگر انشائے خلیفہ اور انشائے مادھورام سے کم نہیں عبارت سلیس، محاورہ خاص ایرانی بندش چست نہ ہو تو ہار جاوں۔»[11]

بزم خیال ۱۳۲۷ ھ۔۱۹۰۹ ع میں تین ضخیم جلدوں میں چھپا ہے۔ پہلی جلد

۳۰۴ صفحات کی تھی ، دوسری جلد ۳٦۷ کی اور تیسری جلد ۲۸٦ کی اور اس طرح جملہ ۹۵٦ صفحات پر بزم خیال پھیلی ہوئی ہے اور جدید دور کے طویل ناولوں میں کسی سے پیچھے نہیں ہے ۔ اس ناول میں حیدرآباد کے جاگیردارانہ ماحول کی عکاسی ہے ۔ مہاراجہ کی یہ بڑی خوبی ہے کہ انہوں روایتی ، طلسماتی اور مافوق الفطرت کرداروں کی بجائے حقیقی کرداروں کو جگہ دی ہے اور ان کے سارے کردار حیدرآباد کے جاگیردارانہ ماحول کے نمائندہ ہیں ۔ مناظر حیدرآباد کے ہیں ، شادی و بیاہ کے رسم و رواج حیدرآباد کے ہیں زبان اور مکالمے حیدرآباد کے ہیں مختصر یہ کہ مہاراجہ نے اپنے ناولوں میں حیدرآبادی تہذیب و معاشرت کی منہ بولتی تصویریں پیش کردی ہیں ۔

محب حسین ۱۸۵۱ ع میں بمقام اٹاوا پیدا ہوئے اور حصول تعلیم کے بعد دیگر ہندوستانیوں کی طرح یہ بھی تلاشِ معاش اور طلب عہدہ میں ۱۸۷۷ ع میں اسی شہر نگاراں حیدرآباد کا رخ کیا اور ملازمت اختیار کی ۔ ۱۸۸۰ ع میں مولانا جمال الدین افغانی کی شہ پر صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور پہلے پہل معلم شفیق (۱۸۸۰ ع) پھر معلم نسواں (۱۸۹۲ ع) اور روزنامہ علم و عمل (۱۹۰۴ ع) جاری کیا ۔ محب حسین کانگریس کے حامی ، ایک قومی نظریہ کے طرفدار ، محنت کش طبقات کے ترجمان ، حقوق نسواں کے محافظ ، صحافتی آزادی کے علم بردار اور بقول ڈاکٹر زینت ساجدہ سماجی اصلاح کے مبلغ تھے ۔ انہوں نے ریاضی ، کیمیا ، طب ، الہیات پر قلم اٹھایا ۔ وہ شاعر بھی تھے لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیتیں متاثر کن ثابت نہ ہوئیں ۔ وہ آخری عمر میں حضرت سردار بیگ صاحب قبلہ کے مرید بھی ہوئے ۔ ان کے سیاسی خیالات کی وجہ سے آصفجاہ سابع نے انہیں شہر بدر کیا چنانچہ غریب الوطنی کی حالت میں ان کا انتقال ۱۹۳۳ ع میں ۸۲ برس کی عمر میں بمقام گلبرگہ ہوا ۔ تدفین حیدرآباد ہی میں عمل میں آئی ۔[۱۲] محب حسین نے ناول سیتا ، سوہان روح ، پہلا جرم اور امیر علی ٹھگ لکھے ہیں ، وہ نذیر احمد ، سرشار اور شرر کے معاصرین میں سے تھے ۔ ان ناولوں میں پہلا جرم اور امیر علی ٹھگ بہت مشہور ہوئے ۔ یہ دونوں ناول طبع زاد نہیں ہیں بلکہ ترجمہ ہیں ۔ کرنل میڈوبز ٹیلر

جو دکن میں لھگوں کی تادیب و خاتمہ کے لئے متعین تھا اور جس کا بیشتر وقت شوراپور اور الند میں گذرا (چنانچہ شوراپور میں ٹیلـــر کا بنگلہ اور الند میں حویلی کے آثار اب بھی موجود ہیں) اس نے امیر علی ٹھگ کی کہانی لکھی تھی جس کا ترجمہ محب حسین نے کیا۔ پہلا جزم ۱۹۰۰ع میں ترجمہ ہوکر شائع ہوا تھا ۔

ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۱ع - ۱۹۱۲ع) اُردو نثر کی ان برگذیدہ شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے ہندوستانی معاشرت میں اصلاح و فلاح کی تحریک چلائی ۔ ان کے معاصرین میں مولانا محمـــد حسین آزاد ، علامہ شبلی ، مولانا حالی اور سر سید احمد خان جیسے اولوالعزم ، صاحب علم و فن ، مصلحین قوم اور اردو کے صاحب طرز نثر نگار شامل تھے اور بشمول نذیر احمد عناصر خمسہ سمجھے جاتے تھے ۔ ان کی اصلاحی تحریکوں نے غزل میں عظیم انقلاب . . . . بپا کیا تھا ۔ اور نثر میں بھی قصہ کہانیوں کی جگہ اصلاحی مضامین لکھے جانے لگے تھے ۔ نذیر احمـــد کے ناول اصلاحی معاشرہ میں نمایاں کارنامے انجام دے رہے تھے ۔ اہل حیدر آباد میں ان کے قیام نے یقیناً یہاں کے نثر نگاروں کو متاثر کیا ہے ۔ نذیر احمد بہ سلسلۂ ملازمت ۱۸۷۷ع میں حیدر آباد آئے اور ان کا قیام عرصہ دراز تک رہا ۔ ان کے ناولوں میں منتخب الحکایات ، چنـد پنـــد ، بنات النعش ، ابن الوقت ، محصنات اور رویائے صادقہ اہم ہیں ۔ یہ ناول حیدر آباد کے قاریوں اور ناول نویسوں کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے ۔ نذیر احمد کے بعد رتن ناتھ سرشار کی شخصیت ایسی ہے جس نے حیدر آبادی معاشرت اور ادب کو متاثر کیا ہے ۔ گو دبدبہ آصفی ۱۳۱۵ھ - ۱۸۹۷ع میں جاری ہوا اور اسی مناسبت سے سرشار کی دکن میں آمد کی تاریخ بھی یہی سمجھی گئی تاہم سید محمد فاروق کے بیان کے مطابق وہ ۱۸۹۵ع میں حیدر آباد آچکے تھے اور نہ صرف مہاراجہ سر کشن پرشاد کے لطف و عنایات سے مستفید ہوئے بلکہ تا دم زیست مہاراجہ کی ڈیوڑھی میں قیام پذیر رہے ۔ [۱۲] مہاراجہ سر کشن پرشاد سرشار کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کی تحریروں سے وہ متاثر بھی تھے چنانچہ انھوں نے اسکا اعتراف بھی کیا ہے ۔ سرشار کے ناولوں میں سیر کہسار ، جام سرشار اور فسانۂ آزاد بہت مقبول ہوئے ۔

عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰ع تا ۱۹۲۶ع) نے اُردو میں تاریخی ناول کی ابتداء کی ان کے اکثر ناول نصف تاریخی اور نصف رومانی ہوا کرتے ہیں۔ حقیقت اور بہار کے اس عجیب و غریب امتزاج سے جو کہانی انہوں نے لکھی ہے وہ تاریخ کا ادراک اور عشق کا مزہ دے جاتی ہے۔ اور پھر زبان لکھنؤ کی اور انداز شرر کا اپنا ہے، دو آتشہ! انہوں نے کوئی تیس ناول لکھے جن میں فردوس بریں فن ناول نگاری کا کوہ نور ہے اس ناول کو جو مقبولیت نصیب ہوئی بہت کم کسی ناول کو نصیب ہوئی ہوگی۔ منصور موہنا، حسن انجلینا، زوال بغداد، ملک العزیز ورجنا ان کے دوسرے ناول ہیں۔ شرر حیدرآباد میں رہے اور کچھ عرصہ تک وہ رسالہ دلگداز بھی شائع کرتے رہے۔ «ایام عرب» حیدرآباد کی دین ہے۔ نذیر احمد، سرشار اور شرر کی موجودگی نے حیدرآباد کے ناول نگاروں کو یقیناً متاثر کیا ہے حیدرآباد میں ناول نگاری کا یہ ایسا زمانہ تھا جب کہ حالات پرامن تھے اور لوگ باہر سے آ آ کر اس «دار الامان» میں راحت اور سکون کی زندگی گذارتے تھے۔ نذیر احمد نے جس طرح توبۃ النصوح اور ابن الوقت میں اصلاح معاشرہ کا خاص نقطۂ نظر پیش کیا ہے یہاں حیدرآباد میں اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ مسلمانوں کی حکومت کا احساس یہاں نقطۂ عروج پر تھا اور ایک اطمینان سا تھا جس کے سبب علوم و فنون، شعر و ادب اور تہذیب و تمدن کی قندیں پروان چڑھ رہی تھیں۔ ایسے ماحول میں سرشار اور شرر کے ناول تفریح طبع کا باعث تھے۔ اہل لکھنؤ کی چٹخارہ دار زبان نے اہل حیدرآباد کی لسانی ضیافت کا اہتمام کیا تھا یہ ضیافت اس دعوت سے زیادہ قیمتی تھی جو حیدرآباد کے بادشاہ اور امراء نے ان ادیبوں اور دانشوروں کے اعزاز میں دی تھی۔

دکن کے ناول نگاروں میں صغرا ہمایوں مرزا بھی شامل تھیں۔ ۱۸۸۴ع میں پیدا ہوئیں، والد ڈاکٹر صفدر علی مرزا نے ماحول کے اعتبار سے ان کی تعلیم و تربیت کی اور اٹھارہ برس کی عمر میں ان کی شادی (۱۹۰۱ع) پٹنہ کے ایک روشن خیال بیرسٹر سید ہمایوں مرزا سے کردی جو حیدرآباد میں پریکٹس کرتے تھے۔ بیرسٹر صاحب کی ہمت افزائی نے صغرا کی ادبی صلاحیتوں کو ابھارنے کا موقع

دیا۔ ورنہ صغرا جس زمانے میں سانس لے رہی تھیں اُس کا حال ڈاکٹر زینت ساجدہ کی زبانی سنئے :

"کچھ ایسا ہی نیم سوتا، نیم جاگتا ماحول تھا جب صغرا ھمایوں مرزا نے قلم سنبھالا۔ زیادہ شرمانے کی ضرورت نہیں، ہندوستان ہی نہیں بلکہ اکثر ایشیائی ممالک کی خواتین میں ابھی قلم سنبھالنے کی اہلیت پیدا نہ ہوئی تھی یا سکت پوری طرح نہ آئی تھی۔ عورت گھر کی ملکہ، بچوں کی پیاری ماں، اور سسرال کی تابعدار بہو یا پرایا مال بیٹی تھی۔ جس کی دیکھ ریکھ کرتے دل ہولتا اور ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں ماں باپ کا رنگ پیلا پڑ جاتا — یہ تو خوش قسمت بہو بیٹیوں کا حال تھا اور جو قسمت خراب ہوتی تو بھی عورت پاؤں کی جوتی اور بے دام کنیز تھی —

ہم تو بابل تیرے کھونٹے کی گئیاں — جدھر ہنکاؤ ہنک جائیں
ہم تو بابل تیرے انگنا کی چڑیاں — جدھر اڑاؤ اڑ جائیں

آثار قدیمہ کی طرح یہ شبیہیں ڈھولک کے گیتوں میں محفوظ رہ گئی ہیں ورنہ کسی کو اس حالت پر اعتبار نہ آتا" [۱۴]

اس ماحول میں صغرا ھمایوں مرزا نے ناول لکھے اور اس ماحول ہی کو انہوں نے اپنا موضوع بھی بنایا۔ ایک محب حسین تھے مردوں میں، دوسرے عورتوں میں صغرا ھمایوں مرزا جو اپنے قلم کے ذریعہ عورتوں کی بیداری کے لئے لکھ رہی تھیں۔ "معلم نسواں" اور "النساء" کی ان خدمات کو ہم فراموش نہیں کرسکتے۔ صغرا نے اپنے ناول کے لئے حیدرآباد ہی کے ماحول کو چُنا اور یہاں کی خواتین کو اپنے ناولوں کا کردار بنایا۔ سرگذشت ہاجرہ فن ناول نگاری کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہے یا نہیں یہ ایک الگ بحث ہے لیکن اگر کسی ناول نے اپنی اثر انگیزی کے ذریعہ ماحول میں تغیر پیدا کیا ہے تو یقیناً اس ناول کی بڑی اہمیت ہے۔ اس ناول میں پردہ کے خلاف آواز بلند ہوئی، تعلیم کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ کفایت شعاری اور سلیقہ شعاری کی تعلیم دی گئی اور ہمدردی، انسانی دوستی اور آداب و اخلاق پر ساری توجہ صرف کی گئی۔ اصلاحی ناولوں میں صغرا کے

ناول سرگذشت ہاجرہ، موہنی، بی بی طوری' کا خواب اور مشیر نسواں شامل ہیں۔
مشیر نسواں پر رائے دیتے ہوئے حالی نے لکھا ہے :

«ہندوستان کی شریف اور ذی لیاقت خواتین میں سے ایک سید ہمایوں مرزا بیرسٹر کی اہلیہ محترمہ ہیں۔ جنھوں نے «مشیر نسواں» لکھ کر اپنے ہم جنس طبقے پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ کتاب ناول کے پیرایہ میں لکھی گئی ہے اور کافی نصیحت آمیز ہے۔ لایق مصنفہ نے مشیر نسواں میں وہ نتائج جو اولاد کے بے تربیت رہنے سے پیدا ہوتے ہیں یا لڑکوں کا بے ادب، بد تمیز اور نافرمان ہونا یا لڑکیوں کی کاہلی، سستی اور ضد ہٹ وغیرہ کو نہایت خوبی کے ساتھ دکھایا ہے۔ ۔۔۔۔۔ یہ ناول فرقۂ نسواں کے لئے نئی معلومات فراہم کرتا ہے۔»[۱۵]

اسی طرح خواجہ حسن نظامی نے «نصیحت کے موتی» پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں ملک کے ممتاز بزرگوں، درویشوں، اوتاروں کی نصیحت آمیز کہانیاں نہایت سلیقے سے ترتیب دی گئی ہیں جن کے اندر ایک خاص جذبہ پایا جاتا ہے۔»[۱۶]

صغرا ھمایوں کے ناول مجموعہ نصائح (۱۹۲۱ ع)، سرگذشت ہاجرہ (۱۹۲۶ ع) موہنی، مشیر نسواں (۱۲۳۰ ھ) اور بی بی طوری' کا خواب (۱۹۵۳ ع) میں شائع ہوئے۔ اسی زمانہ میں صغرا کے شوہر ھمایوں مرزا کا ایک ناول کرشمہ تقدیر (۱۹۱۶ ع) میں شائع ہوا تھا۔

«عزیز احمد «بقول نظر حیدرآبادی» حیدرآباد کے مشاہیر لکھنے والوں میں ہیں اور کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ شعر، ڈرامہ، افسانہ، ناول اور تنقید میں اپنی طبع خداداد کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ ان کے بعض ہنگامہ خیز ناول نے بڑی شہرت پائی ہے۔»[۱۷]

عزیز احمد جامعہ عثمانیہ کے شعبہ انگریزی میں لکچرر تھے پھر پروفیسر ہوئے ۱۹۴۷ ع میں پاکستان چلے گئے۔ حیدرآباد میں جب تک رہے ادبی محفلوں میں ان کا «ذکر جمیل» ہمیشہ رہتا۔ ان کی شخصیت بڑی دلآویز تھی اور وہ اپنی رومان

پرورِ افتادِ طبیع کی وجہ سے جامعہ عثمانیہ اور اس کے باہر کے ماحول میں بے حد مقبول ہوگئے تھے ۔ وہ دوران قیام حیدرآباد اور پاکستان منتقلی کے بعد بھی ناول لکھتے رہے ۔ ان کے دو ناول "ہوس" اور "مرمر اور خون" ۱۹۴۳ع تک شائع ہوچکے تھے تیسرا ناول "گریز" ۱۹۴۵ع میں شائع ہوا۔ آگ (۱۹۴۷ع)، ایسی بلندی ایسی پستی (۱۹۴۸ع) اور شبنم (۱۹۵۰ع) میں، عزیز احمد کی ناول نگاری کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں

"ان سب ناولوں میں عزیز احمد نے اپنے دور کی روح کو لفظوں میں سمیٹ لیا ہے۔ اس وقت خود عزیز احمد جوان تھے اور ان کی عمر ۳۷ سال تھی۔ عزیز احمد کی ناول نگاری نے اردو ناول کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان ناولوں کے بغیر ہم اس دور کی معاشرت و رجحانات، اس کے تضاد اور کشاکش کا عرفان حاصل نہیں کرسکتے۔ اردو ادب میں یہ دور روایت شکنی کا دور تھا اور پرانی اقدار اور رسوم کے خلاف بغاوت کا ایک سیلاب تھا جو نوجوان نسلوں کے ذہنوں میں موجزن تھا۔ فرائیڈ کے نظریۂ جنس میں انسانی جبلت کے نئے امکانات نظر آرہے تھے۔ ڈی ایچ لارنس منٹو کا ہیرو تھا اور عزیز احمد کا بھی۔ منٹو نے افسانوں کے ذریعے اور عزیز احمد نے اپنے ناول میں انسان کی جبلت کو موضوع بنایا۔ ان ناولوں پر فرانسیسی حقیقت نگاری کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ ان سب ناولوں میں فرد اہم ہے لیکن ایسی بلندی ایسی پستی میں ان کا زاویۂ نظر بدل جاتا ہے اور وہ فرد کے مطالعہ سے جاگیردارانہ معاشرے کی پشت اجتماعی کا اتنی فن کاری سے مطالعہ کرتے ہیں کہ اس ناول میں فرد کا المیہ ایک تہذیب کا المیہ بن جاتا ہے "[18]

عزیز احمد نے "شبنم" کو سب سے آخر میں یعنی ۱۹۵۰ع میں شائع کیا۔ اسی وجہ سے جمیل جالبی کو اس کے تجزیہ کے موقع پر کہنا پڑا۔ "عزیز احمد کے ناول شبنم میں پھر تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔" حالانکہ یہ تبدیلی عزیز احمد میں "پھر" نمایاں نہیں ہوئی۔ مجھے یقین ہے عزیز احمد نے اپنے اولین دور ہی میں شبنم کو لکھ ڈالا تھا مگر چند در چند مصلحتوں یا مجبوریوں کی وجہ سے اسکی

اشاعت جلد ممکن نہ ہوسکی اور ہوس، مرمر اور خون، گریز اور آگ پہلے شائع ہوگئے۔ جس طرح عزیز احمد نے اپنے ناولوں خصوصاً ایسی بلندی ایسی پستی میں حیدرآباد دکن کے طبقۂ امراء کو موضوع بنایا ہے اسی طرح شبنم کا ماحول جامعہ عثمانیہ کا ماحول ہے۔ شبنم اور دوسرے کردار اسی ماحول کے پروردہ ہیں۔ جس زمانہ میں وہ یہاں انگریزی پڑھاتے اور اُردو پڑھتے اور لکھتے تھے اس وقت آتش جواں تھا اور جامعہ عثمانیہ کے نیم مخلوط ماحول نے ان کے رومانی جذبات کو اور بھی برانگیختہ کردیا تھا شبنم کے کردار فرضی ہوتے ہوئے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے اسی ماحول کے جیتے جاگتے، ہنستے بولتے اور چلتے پھرتے کردار ہیں اور حقیقی ہیں بہرحال یہ حقیقت ہے کہ عزیز احمد نے ناول ہو یا افسانہ فرانسیسی ادب سے متاثر ہوکر تخلیق کیا ہے۔ حالانکہ اس زمانہ میں روسی ادب اور ترقی پسندی کے چرچے عام تھے حیدرآباد میں یہ نیا رجحان گو اپنی ابتدائی مراحل میں تھا لیکن فیشن کے طور پر ہی نسل اسکی طرف راغب تھی عزیز احمد نے حیدرآباد کے رواداری اور کھلے ماحول میں ترقی پسندی کو غیر ضروری ہی سمجھا۔ اور آخر تک وہ اس رجحان سے متاثر نہ ہوئے۔

عزیز احمد ۱۱ نومبر ۱۹۱۳ ع کو بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ اور دسمبر ۱۹۷۸ع کو لندن میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ بڑے فن کار تھے اور بقول جمیل جالبی ان میں ایک سچے فن کار اور بڑے ادیب کا ایسا انکسار تھا جو اس دور میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ یحیٰ صدیقی گلبرگہ کے رہنے والے اور جامعہ عثمانیہ میں مخدوم، میر حسن اور ظفر الحسن کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ان کے دو سماجی ناول شائع ہوئے ہیں۔[19]

کرشن گوپال عابد، قیسی رامپوری، کوثر چاند پوری اور ایم۔ اسلم کا گو تعلق حیدرآباد سے نہیں ہے لیکن ان کے بعض ناول حیدرآباد سے شائع ہوئے ہیں۔

عہد آصفیہ میں جو ناول شائع ہوئے ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد (سرمایۂ سعادت، چنچل نار، بزم خیال، مطلع خورشید اور فسانہ شیدا) محب حسین (سیتا، سوہان روح، پہلا جرم اور امیر علی ٹھگ) محمد

سلطان عاقل (سراپا الفت ۱۸۹۴ع) محمد علی بشیر (احسـوان الشیاطین ۱۸۹۹ع) لطف علی خان سہیل (فرخ مرزا ۱۸۹۳ع) ظفر علی خان (سیر ظلمات اور جنگل میں منگل ۱۹۰۱ع) عبدالحلیم شرر (ایام عرب ۱۹۰۸ع) صغرا ہمایوں مرزا (مجموعہ نصائح، سرگذشت ہاجرہ، مشیر نسواں، موہنی اور بی بی طوری' کا جواب) سجاد حسین کسمنڈی (نشتر اور قصہ محمد حسین ۱۳۱۱ھ) نادر علی برتر (اسرار عصمت اور عابدہ ۱۹۰۰ع) محمد اعجاز علی شہرت (دیار الفت ۱۹۰۰ع) مولوی اکبر علی معجـزۂ محبت) .... احمد اللہ خان (احسان عظیم ۱۰۳۱ھ، کالج کے ہیرے ۱۹۴۵ع اور حوری تیکڑی ۱۹۰۰ع ماعمد) میر غضنفر علی قومی جنگ (خیال قوی ۱۹۰۰ع) امجد علی جودت (معاشرت ۱۹۰۰ع) سید ضمیر الدین نقوی (فرشتۂ رحمت) محمد احمد صدیقی (بلخ کی شہزادی) قادر نواز جنگ (شیراز کی مہر بانو اور، جان دشمن) محمد سجاد مرزا (تمنائے دید) میر محمد علی خان ناظم (نئی روشنی ۱۹۱۵ع) میر فضل علی (بھولی صورت ۱۹۲۳ع) محمد عبدالغفار مسرور (فنا فی المحبوب ۱۳۱۸ھ) عظیم النسا بیگم (لیلیٰ) حبیب احمد (نگاری بانو ۱۹۳۶ع) عبدالکریم خان (شمشیر بے نیام ۱۳۲۴ھ' ہمایوں مرزا (کرشمۂ تقدیر ۱۹۱۶ع) شبیر حسین قیس زرتاج ۱۹۳۷ع) عطاءالرحمن خان (ایثار نسوانی ۱۹۳۹ع) ابو ظفر موئید الدین حسن (انجام غفلت ۱۹۲۷ع) مرزا ظفر الحسن (محبت کی چھاؤں ۱۹۳۹ع) عطاءالرحمن (کاشانۂ نادر ۱۹۳۸ع) سید نور الحسن (سیل حوادث ۱۹۴۰ع) محبوب دکنی (بہن ۱۹۴۱ع) ظفر قریشی (سادہ و رنگین ۱۹۴۴ع) ممارز الدین رفعت (بغـداد کا خلیفہ ۱۹۴۵ع) محمد شمس الدین صدیقی (غیرت النساء) ظفر واسطی (دل کی آگ) سیدہ مظہر (صیغم ۱۹۴۵ع) سہیل عظیم آبادی (نئے پرانے) ابو احمد (سندباد جہازی ۱۳۵۵ف) نظر حسین فاروقی (محبوب محترم یا پوپ خان ۱۳۱۱ھ) عبدالمی خان (پرکالۂ آفت ۱۳۳۰ھ) نصیر احمد عثمانی (خاندانی آسیب ۱۲۵۳ھ) قاسم علی شاہ (حدیث عشق دل ریش ۱۳۲۶ھ) کوثر چاندپوری (نوک جھونک ۱۹۴۴ع) حـیرت بدایونی (جنگل کانفرنس اور شہہ سوار ۱۹۴۵ع) نعیم کوثر (ہونہار شہزادہ ۱۹۴۶ع) طیبہ بلگرامی (انوری ۱۳۴۶ھ) راحت النسا بیگم (اچھی لڑکی ۱۳۶۳ھ) قیسی رام پوری (تسنیم، سزا، چوراہا، دھوپ اور خطا ۱۹۲۵ع تا ۱۹۴۴ع) قـدوس صہبائی (پریم پوجارن) مجنوں گورکھپوری

(سراب، صید زبوں ۱۹۴۵ ع) مسلم ضیائی (بواقی کیتلی، کالا دیو، چھنگلی خان، ششی تارو، قم قم قما قیل ۱۹۴۴ ع) کرشن گوپال عابد (غرور کا انجام، لڑکے کا خواب، چالاک مرغا اور چوہیا بیگم ۱۹۴۵ ع) اسرار ندوی (اندھیر نگری ۱۹۴۵ ع) خاموش فتح پوری (مقدس چرخہ اور ماں کی مامتا ۱۹۴۶ ع) سید علی شاکر (چلم گرٹ ۱۹۴۶ ع) عشرت بخاری (مغنیہ ۱۹۴۶ ع) عطاالرحمن وحیدانی (لیلیٰ کی ڈائری ۱۹۴۶ ع) تسنیم مینائی (لال چندری ۱۹۴۶ ع) ایم۔ اسلم (خانقاہ ۱۹۴۷ ع) عظمت اللہ خاں (سورما چن، زندہ بدست مردہ، من چلا اور گڑیا خانہ) عبدالحمید (سمیر آف لنوڈ) نجم آفندی (چور ماموں) کوثر چاند پوری (کبڑا جادوگر ۱۹۴۶ ع) اور اظہر افسر (دور دیس کی شہزادی ۱۹۴۶ ع)۔

یوں تو حیدرآباد سے بہت سے ناول نگار اُبھرے اور اپنے خیالات و جذبات کی کہکشاں انہوں نے سجائی ہے۔ حیدرآبادی تہذیب کی نمائندگی کی ہے، یہاں کی شائستگی اور تہذیب کی ترجمانی ان کے یہاں ملتی ہے اور اصلاح و فلاح کا جذبہ بھی ان کے ناولوں میں ملتا ہے خصوصاً جامعہ عثمانیہ کے قیام نے یہاں کے فنکاروں کو اتنا شعور تو ضرور عطا کیا کہ وہ جاگیرداری اور منصبداری کی فضا میں اپنی تہذیبی خامیوں اور معاشرتی برائیوں کو محسوس کریں عورتیں تو عورتیں مردوں کے اندر جو ناخواندگی ہے اس کا احساس ہوا اور تعلیمی شعور کے عام ہوتے ہی پرانی قدریں چٹخنے اور ٹوٹنے لگیں اور ناولوں کے نسوانی کردار، تعلیم اور اس کی افادیت، سلیقہ مندی، کفایت شعاری، اور گھٹن سے نجات پانے اور ترقی کرنے کی خواہش کے ساتھ اُبھرے لیکن سقوط سلطنت کے ادھر دس بارہ سال قبل جو ترقی پسند تحریک دبے پاوں داخل ہوئی تھی ابھی بال و پر لانے نہ پائی تھی اسکی سرگرمیاں شمالی ہند میں لکھے گئے ناولوں، افسانوں، شاعری اور تنقیدوں کے مطالعہ تک محدود تھیں یا پھر مضامین لکھے جانے لگے۔ ادبی نشستیں ہوئیں اور انجمن آرائی کا آغاز ہوا مگر کوئی ناول ایسا نہیں لکھا گیا جو اس تحریک سے متاثر رہا ہو۔ ناول نگاروں کی اس طویل فہرست میں چند ایک ناول نگاروں کو چھوڑ کر ایسے نہیں ہیں جنہیں اُردو ناول نگاروں کی اولین صف میں جگہ دے سکیں اور یہ بھی المیہ ہے کہ خود اُردو ادب میں ایسے بہت کم ناول لکھے گئے جو عالمی ادب میں ممتاز جگہ پاتے ہوں۔ ماحول جاگیردارانہ تھا اور مسلمانوں کی حکومت کے ہونے کا ایسا اطمینان تھا کہ ہم عالمی تحریکوں اور نظریوں سے بڑی حد تک بے نیاز تھے۔ ایک طبقہ معاشرہ میں ایسا تھا جہاں دولت کی فراوانی تھی،

رنگا رنگی تھی اور ریل پیل تھی۔ دوسرا طبقہ افلاس زدہ تھا اور شہر سے دور دیہاتوں میں رہتا بستا تھا اور شاہ کو دعا دیتا تھا۔ حصول علم کی خواہش پہلے طبقہ کو اس وجہ سے نہیں تھی کہ انہیں کوئی ملازمت کرنی نہ تھی انہیں کوئی مدرس یا اہلکار بننا نہیں تھا اور دوسرا طبقہ اس کا شعور ہی نہیں رکھتا تھا۔ اور اگر کوئی اپنی صلاحیت سے علم حاصل کرنے کے لئے شہر پہنچ بھی جاتا تو ایک معاشی بدحالی کا شکار رہتا عجیب ماحول تھا جس کی عکاسی اس دور کے ادب میں ہم کو نہیں ملتی۔ یہ نہیں تھا کہ موضوعات کی کمی تھی، شعور کی کمی اور اپنے وجود کے عدم احساس نے باشعور ناول نگاروں کو اُبھرنے نہیں دیا۔

حواشی

۱، ۳ اصناف ادب اردو مولفین قمر رئیس، خلیق انجم ص ۱۱۵

۲، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ از احتشام حسین ص ۱۹۸

۳، ۵، ۶ مہاراجہ چندو لعل شاداں مرتبہ ثمینہ شوکت ص ۵٦٧، ۵٦١، ۵٦٨
ان تینوں قصوں کے مخطوطات کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہیں۔

۷، ۸ مہاراجہ کشن پرشاد مرتبہ حبیب ضیاء ص ۱۳۸، ۱٦

۹، بحوالہ ہماری زبان (دہلی) ۸ اگست ۱۹۵۹ ع

۱۰، بحوالہ دیباچہ ارمغان وزارت ص ۵

۱۱، بحوالہ خود نوشت سوانح عمری مہاراجہ بہادر قلمی ص ۳۱

۱۲، یارانِ شہر از راقم الحروف ص ۱۸۸

۱۳، مہاراجہ سرکشن پرشاد مرتبہ ڈاکٹر حبیب ضیاء ص ۲۲۴

۱۴، یاد صغرا ہمایوں مرزا ص ۱۵

۱۵، ۱٦ " " ص ۵۳

۱۷، یارانِ شہر از راقم الحروف ص ۳۵

۱۸، ماہنامہ سب رس (حیدرآباد) مئی ۱۹۸۰ ع ص ٦

۱۹، نیا آدم مخدوم نمبر مرتبہ امجد باغی ص ۹۸

●

دکنی ادب اور مُلّا وجہی

از

پروفیسر قیوم صادق، صدر شعبہ اُردو، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

دکھنی زبان کے بارے میں کوئی ستّر سال پہلے تک ہمارے بعض علماے ادب کے دل میں بہت سے شبہات تھے۔ بعض لوگ اسے ڈراوڑ بولیوں کی ایک شاخ سمجھتے تھے اور کچھ حضرات کا یہ خیال تھا کہ یہ مسخ شدہ اُردو ہے۔ جدید دور کے علماء میں گریرسن سب سے پہلا عالم تھا جس نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف، «لنگوسٹک سروے آف انڈیا» میں بعض غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی چنانچہ وہ لکھتا ہے:

«عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ دکھنی مسخ شدہ ہندستانی ہے، لیکن تاریخی اعتبار سے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ادبی ہندستانی بگڑی ہوئی دکھنی ہے، کیونکہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ہندستانی ادب کا آغاز دکھن میں ہوا۔»

گریرسن نے دکھنی کی تعریف اس طرح کی ہے:

«دکھنی، ہندوستانی کا وہ روپ ہے، جو دکن کے مسلمان استعمال کرتے ہیں، اُردو کی طرح وہ فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے، لیکن اس میں فارسیت کا اثر بہت کم ہے» اس تعریف میں «دکھنی مسلمانوں» کی تحدید غیر ضروری ہے، کیونکہ اس زبان کے بولنے والوں میں سبھی طرح کے لوگ شامل ہیں اور دکھنی کے شعـــراء اور مصنفین میں بھی اسی طرح ہر مذہب اور ملت کے لوگ موجود ہیں۔

گریرسن کے بعد دوسرے ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی ہیں جنھوں نے لکھا ہے کہ:

«ہندوستانی کو ادبی اغراض کے لئے سب سے پہلے سترھویں صدی عیسوی میں سنجیدگی کے ساتھ ان مسلمانوں نے استعمال کیا جو دکن میں رہ گئے تھے»

دکنی ادب باعتبار زبان، اُردو کی ابتدائی صورت ہے۔ صدیوں کے تغیرات

نے اس دور کی اور اس زمانے کی زبان میں بڑا فرق پیدا کردیا ہے پھر دکنی ادب میں دکن کی مقامی بولیوں کے گہرے اثرات بھی ہیں۔

دکن کی پوری شاعری میں ملکی ماحول گہرے طور پر رچا بسا ہے۔ ہندی تشبیہات، استعارات، تمثیلیں عام ملکی الفاظ، محاورے، ہندو دیو مالا، غرض دکنی ادب پر ہندی ماحول اور تہذیب کا گہرا اثر ہے اس اعتبار سے دکن کی شاعری ایک حقیقت پسند شاعری ہے۔

دکن میں اُردو نثر کے آغاز کے بارے میں اگر بعض روایتوں پر اعتماد کیا جائے تو حضرت شیخ عین الدین گنج العلم کے مختصر مذہبی رسالوں کا نام دکن میں اُردو نثر کے اولین آثار کے طور پر لیا جاسکتا ہے۔

اگر صوفیاے کرام کے کچھ اُردو ملفوظات کو ہم نثر کا آغاز کہہ سکیں تو محمد تغلق کے عہد میں دولت آباد اور خلد آباد آنے والے کچھ صوفیوں جیسے زین الدین خلد آبادی (۷۰۱ھ تا ۷۷۱ھ) کے اقوال بھی دکن کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان پر نثر کا اطلاق بہت ہی ابتدائی مفہوم میں ہوسکتا ہے ان اقوال اور روایتی رسالوں سے قطع نظر دکن میں اُردو نثر کا باضابطہ آغاز حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے اب تقریباً ایک مسلمہ بات ہوگئی ہے۔

حضرت گیسو دراز کے بعد حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق اور انکے فرزند شاہ برہان الدین جانم اور ان کے صاحبزادے شاہ امین الدین اعلیٰ اور اُن کے خلفاء نے دکنی ادب کی بہت بڑی خدمت کی۔

شاہ امین کے گولکنڈہ کے معاصرین میں میراں جی خدا نما، مولانا عبداللہ اور وجہی کے کارنامے دکن میں اُردو نثر کے ارتقاء کے دور کو پیش کرتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ دکھنی ادب میں انسان کو جس طرح پیش کیا گیا وہ عالمی ادب کے لئے بھی باعث رشک ہے۔ اس میں صرف مقامی رنگ ہی نہیں آفاقی آہنگ بھی ہے۔ اس لئے ان جواہر پاروں کی قدر و قیمت دنیائے ادب میں ہمیشہ رہے گی۔ بقول ملا وجہی ــــ

دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے
که سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے

اسد اللہ وجہی، ملا وجہی کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ وجہی کے زمانہ میں ملا کا لقب علامہ کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا جیسے ہمارے دور میں علامہ کا لقب ہم شاعر مشرق کے لئے استعمال کیا کرتے ہیں۔ جو ‹ڈاکٹر› کا اُردو مترادف ہے یا موجودہ اُردو میں اسی ‹ملا› کو ہم مولانا کہہ سکتے ہیں۔ وجہی اور غالب کا نام اسد اللہ تھا اللہ کے یہ دونوں شیر اُردو میں بھی شعر کہتے تھے اور فارسی میں بھی۔ دونوں اُردو میں جتنے بلند پایہ شاعر ہوئے ہیں اُردو نثر لکھنے میں ان کا پایہ اتنا ہی اونچا تھا۔ دونوں اپنے اپنے رنگ اور اسالیب کے امام، موجد اور خاتم تھے اس لئے میں نے اسد اللہ وجہی کو دکنی اُردو کا غالب قرار دیا ہے۔

وجہی کی تاریخ پیدائش ۱۵۵۱ع اور ۱۵۵۶ع کے مابین قرار دی جاسکتی ہے اور وفات ۱۶۵۶ع اور ۱۶۷۱ع کے درمیان۔ یہ قطب شاہی دور کا بلند پایہ اور ممتاز شاعر اور زبردست ادیب تھا۔ گولکنڈے کے چوتھے قطب شاہی فرماں روا سلطان ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا۔ ۱۰۱۸ھ میں ‹قطب مشتری› اور ۱۰۴۵ھ میں ‹سب رس› لکھی۔

وجہی کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ شعری یا نثری تخلیق میں ایمائیت اور رمزیت کو ضروری سمجھتا تھا اور اس کو تمثیل نگاری کا وصف بھی حاصل تھا۔

‹قطب مشتری›، قطب شاہی دور کے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور تاریخی حالات کو پیش کرتی ہے۔ مجلس طرب کے صفات بھی بیان کئے گئے ہیں

ملّا وجہی کو تبحر علمی کے پیش نظر محمد قلی قطب شاہ نے انہیں درباری شعرا میں ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا جس کی وجہ سے اُس کو بادشاہ کا انتہائی قرب حاصل ہوا۔ ملا وجہی کی جدت پسند طبیعت نے اس مصاحبت کا پورا فائدہ اُٹھایا اور محمد قلی قطب شاہ کو اپنی مثنوی ‹قطب مشتری› کا ہیرو منتخب کیا

اور بقول خود ایک منظوم یاد ہمیشہ کے لئے چھوڑ دی۔

ملا وجہی کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

۱) قطب مشتری ۱۰۱۸ھ (مثنوی)

۲) سب رس ۱۰۴۵ھ (نثر)

۳) کلیات فارسی

۴) قصہ ماہ سیما و پری رخ

۵) تاج الحقایق

تاج الحقایق کے بارے میں شک و شبہہ کا اظہار ابھی تک باقی ہے۔ میرے خیال میں یہ وجہ اللہ شاہ گجراتی کی تصنیف ہوگی۔

قطب مشتری:

«قطب مشتری» دراصل قطب شاہی کلچر کا نہ صرف مرقع ہے بلکہ نئی اور اُبھرتی ہوئی دکنی کا پیمانہ بھی اُردو ادب کے ارتقائی منازل میں وجہی نے اپنی طبیعت کی جولانی کا مظاہرہ کرنے کے لئے فارسی مثنویوں کے مقابلے میں قطب مشتری کو دکنی میں تصنیف کیا۔ اسے ہم وجہی کا طرہ امتیاز کہہ سکتے ہیں۔

وجہی کے یہاں تشبیہات و استعارات اس قدر دلکش ہیں کہ ان کے استعمال سے شعر کے حسن میں اضافہ ہوجاتا ہے اس کی تشبیہیں خود بولتی ہوئی نظر آتی ہیں وہ جس چیز کا بیان کرتا ہے اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے اِن تشبیہوں اور استعاروں میں بھی مقامی ماحول اور دریاوں، پرندوں، پھولوں، جانوروں وغیرہ کا ذکر اور کاسی، جوسکی، جوتسی، بھمن، کنول، گنگا، ڈونگراں، پرناں، سپارے، پنکھی، راویاں، راگ وغیرہ الفاظ کا استعمال اپنے اطراف و اکناف یا اِردگرد کی اشیاء کا تذکرہ اس کے صحت مند نقطہ نظر کی ترجمانی کرتا ہے۔

وجہی نے «قطب مشتری» میں شرح شعر کے عنوان سے شاعری کے بارے میں

جو کچھ لکھا ہے وہ شاید قدیم ادب میں ایک انوکھی چیز ہے اس پائے کی کوئی چیز مولانا الطاف حسین حالی کے مقدمہ سے پہلے مشکل سے دستیاب ہوگی۔ اس کی شرح میں تنقید شعر کے بعض ایسے پہلو نکلتے ہیں جو ہر زمانے کے لئے نصب العین کا کام دے سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہتا ہے ــــ

جو بے ربط بولے توں بیتاں پچیس
بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس

پھر کہتا ہے ــــ

سلاست نہیں جس کیرے بات میں
پڑیا جائے کیوں جر اسے کر ہات میں

وجہی کا انداز بیان فطری ہے۔ اشعار رواں دواں، شیریں اور پر تاثیر ہیں۔ بعض مقامات پر جذبات نگاری کا حق ادا کردیا ہے۔ جگہ جگہ خوب صورت منظر کشی کی ہے۔ اُس زمانے کی معاشرت اور تمدن کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں مختلف پیشوں، خواص و عوام کی زندگی، رہن سہن کے طور طریق اور آداب معاشرت کے متعلق بے شمار معلومات فراہم کرتی ہے اور ہمیں بآسانی معلوم ہوجاتا ہے کہ اس زمانے میں درباروں میں اکابر سلطنت کے علاوہ مختلف علوم و فنون کے ماہرین بھی ہوا کرتے تھے۔ نیز دربار خاص اور دربار عام کا بھی رواج تھا۔

اس مثنوی کو پڑھ کر خیال گزرتا ہے کہ اس میں عشق و محبت کے جو واقعات افسانوی رنگ میں پیش کئے گئے ہیں وہ محمد قلی کی عاشق مزاجی کے عین مطابق ہیں اور ان کا درپردہ تعلق محمد قلی اور بھاگ متی کے تاریخی عشق سے ہے۔ اس ضمن میں مولوی عبدالحق کہتے ہیں کہ "ممکن ہے ایسا ہو لیکن کتاب سے اس کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔ وجہی کا مقصد اس مثنوی کے لکھنے سے بادشاہ کے حسن و جمال، شجاعت اور لیاقت کی تعریف کرنا ہے بس"

"اُردو شہ پارے" میں ڈاکٹر زور رقمطراز ہیں:

« اس کی صرف مثنوی ہی نہیں بلکہ غزل اور رباعیوں کے بھی چند نمونے ‹قطب مشتری› میں موجود ہیں جن کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ وہ دراصل دکھن کا ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر تھا۔ اس کی اکثر غزلیں شروع سے آخر تک ایک ہی مضمون پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں بالعموم جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے اور ان کا اُسلوب نہایت پاکیزہ اور فطری ہے۔ ان میں تکلف اور رسمی خیالات کو کوئی دخل نہیں۔ »

•

مثنوی ‹قطب مشتری› میں ایک مرکـــزی شخصیت ہے اور کئی ایک ضمنی شخصیتیں بھی ہیں لیکن وجہی کو کردار نگاری پر دسترس نہیں ہے مثنوی کے اکثر کردار آئیڈیل ہیں مگر ہر جگہ ہر حال میں یکساں رہتے ہیں ماحول کے تغیر و تبدل کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لئے یہ جامد و ساکت معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت لچکدار نہیں ہے۔ اس لئے یہ کردار غیر فطری اور مصنوعی ہیں۔ واقعات و حادثات ان پر اثر نہیں قائم کرتے بلکہ یہ خود ماحول اور فضا پر مسلط ہونا چاہتے ہیں۔

سب رس :

‹قطب مشتری› کی تصنیف کے ٹھیک ۲۷ سال بعد دکنی نثر میں ملا وجہی کا ایک بڑا کارنامہ منصہ شہود پر آتا ہے۔ تمام تذکرے اور تواریخ اس امر کی وضاحت میں ساکت ہیں کہ وجہی نے یہ طویل ستائیس سال کس طرح گزارے البتہ وجہی کے فارسی دیوان سے چند ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وجہی اس درمیان میں حریفوں کے لاگ لگاو کے باعث عتاب شاہی کا شکار ہوگیا تھا۔ اس کے حریفوں میں غواصی کو ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا جاچکا تھا۔ محمد قطب شاہ کی حیات تک وہ عتاب شاہی کی سختیاں جھیلتا رہا لیکن عبداللہ قطب شاہ کے ابتدائی دور میں ہی وہ بادشاہ کے زمرہ خواص میں شامل کرلیا گیا۔ وجہی دراصل ایک آزمائشی دور سے گزر رہا تھا اور موقع کی تاک میں تھا کہ وہ اپنی علمیت اور قابلیت کا سکہ دوبارہ بٹھا سکے۔ عبداللہ قطب شاہ نے وجہی سے ایک

نادر الوقت کتاب لکھنے کی فرمائش کی وجہی فوراً کمر بستہ ہوگیا اور ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۶ع میں اس نے سب رس مکمل کی۔

وجہی اُردو نثر میں ایک دلکش اسلوب کا موجد بھی ہے چنانچہ کہا گیا ہے:

یو صحب نظم ہور نثر ہے حساو بہشت میں قصر ہے

سطر سطر پر برستا ہے نور ہر ایک بولی ہے حور
اسے پڑکر جنے حظ پایا جانو بہشت آیا

«سب رس» دکنی زبان کی پہلی داستان ہی نہیں بلکہ پہلی تمثیل بھی ہے جس میں حسن و دل کا معاشقہ علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ خود ملا وجہی بھی کہتا ہے «ناموس بولیا کہ اس تازہ آب حیات کا قصہ ایک تاویل دھرتا ہے، اک تمثیل دھرتا ہے»

داستان میں ایک نقص یہ ہے کہ عام پڑھنے والے کے لئے اس کی صوفیانہ تمثیل آخر تک ایک راز ہی رہتی ہے۔

«سب رس» ایک صوفیانہ تمثیل ہے اس لئے اس میں تصوف کے مسئلوں اور نکتوں کا بیان مناسب اور برمحل ہے۔ لیکن وجہی نے جس طرح ان بیانات کو طول دیا ہے اور پند و موعظت کے دفتر کھول دیئے ہیں۔ اس کے باعث قصہ میں جگہ جگہ جھول پڑگیا ہے اور اجزائے افسانہ سے تناسب اور توازن غائب ہوگیا ہے۔ دراصل وجہی فن داستان طرازی سے ناواقف ہے وہ یہ نہیں جانتا کہ داستان کی جان تقریروں اور خطبوں میں نہیں۔ تو وہ تو واقعات کی دلچسپی میں پوشیدہ ہوتی ہے یہ صحیح ہے کہ قصے کو سبق آموزی کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے لیکن یہ استعمال صرف اس وقت تک جائز ہے جب تک قصے کی دلچسپی باقی رہے۔ واقعات کو چھوڑ چھاڑ کر قدم قدم پر وعظ کرنے سے قصے کا لطف جاتا رہتا ہے اور قصہ گوئی تفنن طبع کی جگہ تکدر طبع کا باعث بن جاتی ہے۔ سب رس پر اس زاویئے سے نظر ڈالی جائے تو یہ داستان کم اور موعظہ زیادہ

معلوم ہوتی ہے۔

«سب رس» کے لسانی تجزیئے کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ اس کا روزمرہ اور محاورہ اردو سے بہت کچھ مختلف ہے۔ اور اس میں سنسکرت کے بھی ایسے بہت سے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو اُردو میں رائج نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ سب رس کے زیادہ تر الفاظ اُردو کے لئے بالکل اجنبی ہیں جو اُردو میں کبھی بولے نہیں جاتے جو اُردو والوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتے۔

«سب رس» کا ماخذ فارسی کی مشہور مثنوی «دستور عشاق» ہے جسے ۸۴۰ھ میں محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نے لکھا تھا یہ ایک ضخیم مثنوی تھی جس کے پانچ ہزار اشعار تھے پھر فتاحی ہی نے اسے نثر میں قصہ حسن و دل کے نام سے ۸۵۲ع میں لکھا۔ بعض محققوں کا خیال ہے کہ «سب رس» جن پربھاچاریہ کی کتاب بھوبہ چرت (بزبان گجراتی) ۱۳۸۵ع اور کرشن مشر کی کتاب پربودھ چندر اودے (ناٹک) ۱۰۵۱ھ بزبان سنسکرت سے ماخوذ ہے۔

تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ملا وجہی کی کتاب سب رس کسی اور کتاب سے ماخوذ نہیں ہے۔ خود اُس کی اپنی طبعزاد کتاب ہے۔

ڈاکٹر زور «اُردو شہ پارے» میں رقمطراز ہیں:

«وجہی کئی باتوں کے لحاظ سے دکھن کا ایک واحد ادیب ہے اُس کا موضوع خود اُسی کی دماغی پیداوار ہے۔ اس کو اس بات پر فخر تھا کہ اس نے اور شاعروں کی طرح دوسروں سے مضمون اخذ نہیں کیا دوسری زبانوں سے ترجمہ کرنا یا دوسرے مضمون کو ماخذ قرار دینا اس کی نظروں میں چوری اور دغابازی جیسا جرم تھا۔»

وجہی کی زبان اُس کے عہد کی معیاری اور فصیح زبان ہے۔ پونے چار سو سال کی طویل مدت میں ہر زندہ زبان کی طرح اُردو زبان میں بھی کافی تغیرات ہوئے ہیں ان تغیرات کی وجہ سے پونے چار سو سال پہلے کی یہ زبان اب

نامانوس سی معلوم ہوتی ہے بہت سے الفاظ جو اُس وقت فصیح سمجھے جاتے تھے اب ٹکسال باہر ہیں۔ یہی حال آج چار سو سال بعد اس وقت کے ہر مستند ادیب و شاعر کی زبان کا ہوگا چند بے قاعدگیوں کو چھوڑ کر اس کی زبان میں اور موجودہ ٹکسالی زبان میں صرف و نحو کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہوا ہے۔ اور آج بھی بعض الفاظ کے معنی کو نظــــر انداز کردیں تو اس زبان کا مفہوم سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی اس میں عربی، فارسی، ہنــــدی اور سنسکرت کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ اُس زمانے کا رسم خط وہی تھا جس کو اصطلاح میں صوتی إملا کہتے ہیں یعنی کسی لفظ کو ادا کرتے وقت جیسی آواز منھ سے نکلتی ہے ویسا ہی اس کو لکھا جاتا تھا دوسرے الفاظ میں بولنے اور لکھنے میں کامل ہم آہنگی تھی مثلاً نزدیک کو نزیک۔ قلعہ کو قلع، داغا کو داگیا، خماری کو کھماری، جو کچھ کے لئے جیکچ، جو کوئی کے لئے جکوئی وغــــیرہ۔ جن زبانوں سے جو جو الفاظ لیئے گئے تھے ان میں اپنے لہجے کے مطابق تھوڑا بہت تصرف کرلیا گیا تھا (تدکین) یا مولانا وحید الدین سلیم کی زبان میں (دکنانے) کا یہ عمل کبھی اصلی لفظ سے ایک یا ایک سے زیادہ حروف کو کم کرکے کیا جاتا تھا۔ جیسے سورج کیلئے سُرج، پریت کی بجائے پرت، دھرتی کی جگہ دھرت، موہن کی جگہ موَن، دیکھو کیلئے دکھو، سیڑھی کے بجائے سڑھی، سورگ کے بجائے سُرگ

دکنانے کی دوسری صورت اصل لفظوں میں ایک یا زیادہ حرفوں کا زیادہ کرنا تھا۔ جیسے دکھ کو دُوکھ، بات کو بابات وغیرہ

مخطوطہ الہاء۔ الفاظ میں ھ کا حرف غائب کردیا ہے جیسے سکھی کو سکی، مُکھ کو مُک، ساتھ کو سات، الفاظ میں حروف کی حرکتیں بھی بدل گئی ہیں۔ کہیں متحرک حروف کو ساکن، کہیں ساکن حروف کو متحرک، کہیں غیر مشدد کو مشدد اور کہیں مشدد کو غیر مشدد کردیا ہے

جیسے عقل کو عقّل، عِلم کو عِلّم، ابر کو ابّر، غصہ کو غصّہ وغیرہ۔

تاکید کے لئے اسم ضمیر اور فعل کے آخر میں چ بڑھا دی جاتی ہے۔ جیسے دنیا سے دنیاچ = دنیا ہی تون سے تونچ = تو ہی، تیرا سے تیراچ = تیرا ہی، یہ دکنی پر مرہٹی زبان کا اثر ہے۔

حروف ربط کی صورتیں یہ ہیں

منے = میں، سیں = سوں، ستی، تے = سے، کون = کو، تک = تلک، پو = پر، که = کے۔

اس دور کے ادب میں ہندوستانی تلمیحات اور ہندوستانی تشبیہات بھی ملتی ہیں۔ کوئل کی کوک اور پپیہے کی ہوک بھی سنائی دیگی (دے) کا استعمال سب رس میں بڑی بے قاعدگی سے کیا گیا ہے۔

وہ جو کچھ دیکھتا ہے، جو کچھ محسوس کرتا ہے اور جو کچھ اس پر بیتتی ہے ان سب احساسات کو وہ بڑی شاعرانہ دلکشی اور بے ساختگی کے ساتھ بیان کرنے پر قادر ہے

غرض یہ کہ ملا وجہی سے موجودہ اُردو کا رنگ شروع ہوتا ہے وجہی نے یہ دعویٰ کچھ بے جا نہیں کیا ہے کہ

" جو کوئی صاحب فن اچھے گا، اسے یو سخن اثر کرے گا، مست بے خبر کرے گا . . . . ہمنا یاد کرے گا، اپنا دل شاد کرے گا عجب مرد تھا کہے گا، عجب واصل تھا کہے گا، . . . . . . ہادی ہے کہے گا، متاذی ہے کہے گا "

دکنی دیوان۔

پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی مرحوم کو وجہی کی چند دکنی غزلیں دستیاب ہوئی تھیں۔ افسوس کہ اُس کا اُردو کلیات اب تک دستیاب نہ ہوا البتہ فارسی دیوان موجود ہے۔ یہ قلمی نسخہ ۳۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ تقریباً چار ہزار اشعار ہیں

پری رخ و ماہ سیما۔

گارساں دتاسی کی تحقیق کے بموجب ایک مثنوی پری رخ و ماہ سیما بھی ملتی ہے۔

صراط المستقیم فی دین قویم

فارسی زبان میں یہ مخطوطہ وجہی کے نام سے منسوب ہے۔

●

ماہر القادری کے تبصروں میں اصلاحی اشارے

از

خلیق الزماں نصرت، بھیونڈی

"ہم ناقد ہیں اس لئے نہ قصیدہ خواں ہیں اور نہ ہجو نگار۔ دیانت ہمارا شعار اور انصاف ہمارا مسلک ہے۔ جو اربابِ قلم تحسین و ستائش سننے کے خوگر ہیں، ان کی تمناؤں کا "فاران" ساتھ نہیں دے سکتا۔ شخصیتوں کی بلندیوں اور پستیوں کی طرف ہم نہیں دیکھتے۔ ہمارے سامنے نام، نہیں کام ہوتا ہے اور اسی کو دیکھ کر ہم فیصلہ دیتے ہیں۔ لبوں کی مسکراہٹیں اور پیشانیوں کی شکنیں، ہماری تنقید پر اثر انداز نہیں ہوسکتیں۔"

مذکورہ بالا اقتباس ماہر القادری کے ادبی ماہنامے "فاران" کراچی کے مئی ۱۹۴۹ع کے شمارے میں شائع ہوا تھا ماہر القادری کو شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق عطا ہوا تھا بالغ نظری اور فکر و نظر، ہر چیز کو صحت مند اصول و نظریات کی میزان میں تولنا اور بے لاگ کسوٹی پر کسنا، پرکھنا اور پھر نہایت جرأت کے ساتھ اس کا اظہار اس زمانہ میں ایک بڑی چیز تھی جو ان کو ودیعت ہوئی تھی۔ بظاہر وہ ایک ادیب، شاعر اور زباندان تھے مگر ان کی شخصیت میں علم و معرفت کا یگانۂ روزگار جوہر کارفرما تھا

ان کا ماہنامہ رسالہ "فاران"، ذہن و فکر کا ایک مکتب تھا انہوں نے "فاران" کو جو معیار عطا کیا تھا، اس معیار اور اس خاص رنگ کے منفرد ذوق کا دوسرا رسالہ نظر نہیں آیا۔ ماہر القادری کی علمی بلندی اور نقد و نظر نے اردو زبان و ادب کو کجرو ہونے سے اس وقت بچایا جب اردو ادب میں بہت تیزی سے تبدیلیاں ہورہی تھیں کلاسیکل دور کی جگہ نظریاتی ادب تخلیق پارہا تھا۔ اور جب کبھی قوموں اور زبانوں میں اس قسم کی تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں تو بہت سارے ایسے عنصر بھی اس میں در آنے کی کوشش میں دکھائی دیتے ہیں۔ جو زبان و ادب کے مزاج کو مسخ کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔

ماہر القادری نے اردو زبان و ادب کو اپنے اصلاحی تبصروں اور تیکھے

نقد و نظر سے بڑی حد تک اس یلغار سے محفوظ رکھا ہے اور اردو زبان و ادب کی تاریخ میں وہ ایک مستقل موضوع اور چراغ فکر و نظر بن گئے ہیں ان کا علمی و شعری ذوق اس پائے کا تھا کہ وہ برسرِ مشاعرہ اور برسر مجلس بھی غلط انداز فکر اور زبان پر ٹوک دیتے تھے، شخصیتوں کی قدر و منزلت اور سماجی و سیاسی مقام و مرتبہ کا پاس و لحاظ نہ رکھتے تھے

صحیح تلفظ

اردو زبان کے بارے میں ماہر القادری کی لگن اور حدت بہت شدید تھا وہ صحیح تلفظ کے ساتھ صحیح اردو لکھنے اور بولنے کے معاملے میں انتہا پسند تھے، ان کا علمی وقار، وجاہت اور مرتبہ یہ تھا کہ انہوں نے اچھے اچھے زباندانوں کی غلطیوں تک کو نظر انداز نہیں کیا ہے ان کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے انہیں ان کی غلطیوں سے آگاہ کیا ہے۔

تلفظ اور صحیح اردو کے لئے اردو کے مشہور محقق اور عالم رشید حسن خاں کے مقام و مرتبے کو اردو والے جانتے اور مانتے ہیں ان کی کتاب (زبان و قواعد) پر تبصرہ کرتے ہوئے، ماہر القادری نے ایک طرف تو رشید حسن خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ "فاضل مصنف و لغت داں نے اپنی تحقیق، دیدہ وری، اور دقت نظر سے کتاب کے ہر باب کو گنجینۂ الفاظ و معانی بنا دیا ہے اور ریسرچ کا حق ادا کردیا ہے۔" وہیں وہ رشید حسن خاں کی چند تراکیب اور لفظوں سے عدم اتفاق کا اظہار کرتے لکھتے ہیں

"رشید حسن خاں نے خود رفتہ، محبوبہ مقصد (عربی میں بہ کسر صاد ہے۔ فارسی میں بہ فتح صاد نظم کیا ہے اردو میں اب یہ لفظ بہ فتح صاد مستعمل ہے)۔ اسی طرح (منصب، (عربی بہ کسرِ صاد۔ بہ فتح سوم) فارسی والوں کا تصرف ہے اردو میں یہ صرف بہ فتح سوم مستعمل ہے۔

سیّد۔ (عربی میں بہ کسر یائے مشدد ہے اردو میں اس لفظ کا فصیح تلفظ

بہ فتحِ دوم (سیّر) مانا جائے گا۔ ماہر القادری جہاں رشید حسن خاں کی رائے سے متفق ہیں وہیں ایک جگہ اپنے مخصوص مزاج کے مطابق لکھتے ہیں۔ "بعض ایسے مقامات بھی نظر سے گذرے ہیں جہاں فاضل مصنف کی رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ (جسارت) اصلاً بہ فتح اول ہے بول چال میں بہ کسرہ آتا ہے اس لفظ کی دونوں حرکات کو مان لینا چاہئے۔ جسارت کے (ج) کو (زیر) کے ساتھ عوام و خواص میں بولتے ہیں بالکسر ہم نے کسی کو بولتے نہیں سنا ممکن ہے مصنف کے وطن شاہ جہاں پور میں بولتے ہوں

(خباثت) عربی میں (خ) پر (زبر) ہے اردو میں بہ کسر اول بھی ہے۔ دونوں حرکت درجِ لغت ہونا چاہئے "اس صراحت کے ساتھ کہ اردو میں عام طور پر بہ کسر اول مستعمل ہے ص ۲۰۵۔ عام طور پر (خباثت) (خ پر فتح) بولتے ہیں۔ (خدیجہ) اصل کے لحاظ سے بہ فتح اول و کسر دوم ہے۔ بر وزنِ (نتیجہ) اردو میں عام طور پر مستعمل ہے اور عام طور پر بہ فتح اول و بہ فتح دوم مستعمل ہے۔ اس لفظ کی دونوں صورتیں قابل قبـــول ہیں (ص ۲۰۶) یہ ان ناموں یا لفظوں میں ہیں جن کو اصل عربی کے تلفظ سے ہی بولنا چاہئے اور جو لوگ غلط بولتے ہیں ان کی اصلاح کی ضرورت ہے ورنہ عوام تو (ابوذر غفاری) (غ پر کسرہ، ف غیر مشدد) کی جگہ (غـفّاری) بولتے ہیں تو کیا ان کی رعایت سے (غـفّاری) کے تلفظ کی جاہلانہ غلطی کو جائز رکھا جائے؟ جو لوگ غلط بولتے ہیں۔ ان کی اصلاح کی ضرورت ہے

(فـوّارہ) (ص ۲۱۷) کی ف پر پیش۔ (غلاف) (ص ۲۱۸) کے غ پر زبر (ص ۲۱۷) (ندامت) کے نون پر زیر، آخـــر کہاں بولا جاتا ہے جس کو رشید حسن خـان نے جائز قرار دیا ہے۔ کسی خـاص شہر یا قصبہ کا لہجہ سند نہیں بن سکتا۔"

اردو زبانـــدانی میں اردو والے رشید حسن خـان کے مقـام و مرتبے کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور بڑی حــــد تک اردو زبان اور قواعد اردو اور زباندانی پر ان کو سند اور اتھارٹی تسلیم کرتے ہیں لیکن مـاہر القـادری

نے جن مقامات اور جن لفظوں کے اعراب کے بارے میں کلام کیا ہے اس پر اپنی رائے دیکر ایک اہم ریمارک بھی دیا ہے۔ زبان اور قواعد زبان کے ایک عالم کی حیثیت سے بے لاگ اظہار بھی کردیا ہے۔

تذکیر و تانیث

ماہر القادری کا علمی مرتبہ اور ان کی زباندانی اس پائے کی تھی کہ وہ لفظوں کی اصل حیثیت، حالت اور ان کی جنس (تذکیر و تانیث) پر بھی قرار واقعی رائے دیتے رہے ہیں جن کی وجہ سے اردو زبان میں بڑھتی ہوئی غلطیوں کی لے پر روک لگی ہے "عوام" بالاتفاق مذکر ہے لیکن آج اردو والے بھیڑ چال میں اس کی جنس بدل کر مؤنث بولنے اور لکھنے لگے ہیں۔ "ملک کے عوام" کی بجائے "ملک کی عوام" لکھا اور پڑھا اور بولا جانے لگا ہے۔ لیکن ماہر القادری نے رشید حسن خان کی "زبان و قواعد" پر تبصرہ کرتے ہوئے تذکیر و تانیث کے تعلق سے بھی تنقیدی اشارے کئے ہیں "ایجاد" کو پہلے شعراء نے مذکر استعمال کیا ہے مگر عام طور پر اسے تانیث لکھا جاتا ہے۔

کرم حیدری کی کتاب "حکمت بیدار" پر تبصرہ کرتے ہوئے، فرماتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

ان کی "ہوسِ زر" کا ٹھکانا ہی کہاں ہے
"زر" جیسے انہیں کی ہے، زمانہ ہی جہاں ہے

یہاں کرم حیدری نے "زر" کو مؤنث باندھا ہے۔ جبکہ "زر" مذکر ہے۔ حوالے میں انہوں نے صبا کا درج ذیل شعر نقل کیا ہے ؎

خاک حاصل ہے، اس سے مردوں کو
"زر" جو صرفِ قبور ہوتا ہے

ماہر القادری نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجھے حیرت ہے کہ کرم

حیدری نے رر کو مؤنث باندھا ہے۔ شاید چاندی پر سونے کا قیاس کیا ہو۔

اسلامی ادب کے معمار اور اردو کے مشہور مصنف اسعد گیلانی کی کتاب «جہنم کے دروازوں پر» کے تبصرے کے ذیل میں ماہر القادری نے لفظ «فیتہ» کی جنس کے بارے میں بڑے نکتے کی بات کہی ہے۔ اس کتاب کے ص ۱۲۹ پر مصنف نے لکھا ہے: «غلامی کی دو فیتیں لگی ہوئی ہیں» لکھتے ہیں۔ «فیتہ» بالاتفاق مذکر ہے غلامی کے دو فیتے لگے ہوئے ہیں لکھنا چاہئیے تھا۔

ص ۱۶۸ «چاروں طرف کیچڑ ہی کیچڑ تھا» کیچڑ تو مؤنث ہے۔ حوالے میں انہوں نے اختر کا شعر نقل کیا ہے ؎

یہ تیرا میکدہ، خمخانۂ عالم ہما ساقی
ارے ہمارا کیچڑ بھی یہاں تلچھٹ کی ہوتی ہے

محمد ادریس کی کتاب «روشنی کے مینار سے» پر تبصرہ کرتے ہوئے ماہر القادری نے ص ۶۲ پر درج جملے، «اپنی غار سے نکلے — ص ۶۳ ساتھ لگی ہوئی شہد سے سوکھے ٹکڑے کھا لیتے» کے بارے میں لکھتے ہیں۔

«غار اور شہد دونوں بالاتفاق مذکر ہیں»

جوش ملیح آبادی کی «یادوں کی بارات» کے ایک مقام کے بارے میں ماہر نے اُن کا درج ذیل جملہ نقل کیا ہے۔ «میں نے کہا اپنی دوکان کے ایک گوشے میں اوٹ کھڑے کردو۔» پھر گرفت کرتے ہوئے لکھا ہے۔ «اوٹ مذکر نہیں مؤنث ہے۔»

جوش ملیح آبادی نے مزید «وہ دوب کا مخمل» لکھا ہے جب کہ مخمل کو بعض شاعروں نے مذکر باندھا ہے مگر عام طور پر یہ لفظ مؤنث بولا جاتا ہے۔

املا

اردو املا کے تعلق سے فی زمانہ جس غفلت اور لاعلمی کا مظاہرہ ہورہا ہے

اور بعض متجددین ادب اپنی علمیت کا رعب دکھانے کے لئے دانستہ بھی جو املا لکھ رہے ہیں وہ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کا رکھ رکھاؤ اور اس کے حسن کو مسخ کررہے ہیں۔ بالکل کو بلکل لکھ کر یہ لوگ اپنی دانست میں اردو املا کی تجدید اور اس کا احیا کررہے ہیں لیکن اصلاً صدیوں کے تعامل اور تناظر کے درمیان سے وہ تواتر کی ان کڑیوں کو توڑنے کی سعی لاحاصل کررہے ہیں جو اردو کے رسم الخط اور اس کے املا کی روح ہیں اور جس سے اردو املا کا ماضی، حال اور مستقبل مربوط ہے

ماہر القادری کے تبصروں کا اگر سرسری بھی مطالعہ کیا جائے تو اردو زبان اس کے رسم الخط اور اس کے املا سے ان کے والہانہ خلوص کا درد لپٹا ہوا مل جاتا ہے۔ ماہر القادری زبان، اس کے املا، اس کی تذکیر و تانیث، لفظوں کی تصریف کے بارے میں انتہائی سخت موقف رکھتے تھے، وہ جوش ملیح آبادی ہوں کہ رشید حسن خاں۔ کسی کو بھی زبان، اس کی روح اور اس کے قواعد کے آگے جانے کی اجازت دینے کو پسند نہیں کرتے تھے۔

اس سلسلے میں ان کی زباندانی، لفظوں کے استعمال کے بارے میں جانکاری اس پائے کی تھی کہ نصف صدی سے زائد عرصہ بیت گیا ہے مگر اب تک کسی حلقے کی طرف سے اردو زبان، رسم الخط اور املا کے تعلق سے ان کے موقف پر تنقید نہیں ہوئی ہے اردو کے ارباب علم و فن لگاتار ان کے اس موقف کے خاموش حامی رہے ہیں۔

اردو املا کے تعلق سے ماہر القادری کے تبصروں میں جگہ جگہ ایسے اشارے واضح طور پر موجود ہیں۔ جو اردو کے ریسرچ اسکالروں کے لئے دلچسپی کا موضوع بن سکتے ہیں۔

حکیم گلچیں کربالی کی کتاب "آدابِ اردو" پر تبصرہ کرتے ہوئے، املا کے تعلق سے ماہر القادری لکھتے ہیں۔ "کہ جہاں نیاز فتحپوری نے "تہار" کے مقابلے میں "طہار" کو ترجیح دی، تو حکیم صاحب نے "تہار" کو صحیح بتایا۔

ماہر القادری نے اس کی تصـــریف کی ہے۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کی کتاب «ام الکتاب» سے ایک اقتباس نقل کیا گیا ہے۔

«اگر ماضی میں شہد، شہد کا خاصہ رکھتا آیا ہے۔ اور سنکھیا کی تاثیر سنکھیا ہی رہی، تو مستقبل میں شہد شہد ہی رہے گا اور سنکھیا کی تاثیر سنکھیا ہی رہے گی»

حکیم گلچیں نے جملے کی اس ساخت اور املا پر اعتراض کیا ہے اور کہتے ہیں، چاروں جگہ سنکھیا غلط ہے، سنکھیئے ہونا چاہئے لیکن ماہر القادری نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا آزاد نے چاروں جگہ سنکھیا کا املا صحیح لکھا ہے، اس کی دلیل میں وہ لکھتے ہیں کہ اس کا تعلق قواعد سے نہیں ذوق و وجدان سے ہے۔ وہ شخص بے ذوق ہے جو سنکھیا کو جملہ کی کسی بھی حالت میں سنکھیئے لکھتا یا بولتا ہے۔

ماہر القادری کا اشارہ قواعد کی رو سے لفظ سنکھیا کی نصبی یا جری حالت یا معمولی حالت کی طرف ہے۔ اصل حرف جس کے بارے میں جملے کی ساکھ میں تبدیلی کردیتے ہیں، سماعی اعتبار سے بھی اس میں فرق ہوجاتا ہے اور تحریر کی صورت میں بھی لفظ اپنی اصلی ہیئت اور مادہ سے الگ ہوجاتا ہے۔

اس کے عـــلاوہ مذکورہ املا کی درستی کے ضمن میں ماہر القادری نے «روشنی کے مینار» میں اس طرح لکھتے ہیں:

«سونے پہ سوہاگہ» (ص ۳۴) صحیح املا «سہاگہ»۔

«چیخ و پکار» صحیح املا «چیخ پکار»۔

«آشکارہ» (ص ۷۳) صحیح املا «آشکارا»

جوش ملیح آبادی بھی ماہر القادری کے تنقید و تبصرہ کی رد میں جب وہ آتے ہیں بخشے نہیں جاتے۔ صحیح اردو، فصیح اردو اور صحیح املا کے لئے اُن کا قلم کسی امتیاز کو روا نہیں رکھتا جوش ملیح آبادی کی کتاب «یادوں کی برات»

میں املا کی غلطیوں پر اس طرح گرفت کرتے ہیں:

جوش: «ڈغڈغا» کر کٹورا بھر پانی پیتا ہے۔ (ص ۳۱۶)

ماہر القادری اسطرح رقم طراز ہیں کہ صحیح املا «ڈگڈگا» ہے۔

جوش ملیح آبادی نے کتاب کے دوسرے مقامات پر «چھوہرا» کو «چھوہرا»، «حکار» کو «حکاہر»۔ ملائمت کو «ملائمیت» اور ماموں کو ماموں لکھا ہے۔ انہوں نے ایک اور مقام پر چاقو کو «چاکو» اور ہاتھ کی جگہ «ہات» لکھا ہے۔ تراکیب اور املا کی بے تحاشا اور بے شمار غلطیوں کو دیکھ کر ماہر القادری نے آخر میں رائے دیتے ہوئے ایک راز سے پردہ اٹھایا ہے اور حیرت ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ «حیرت ہے کہ جوش صاحب، صرف شاعر نہیں، حیدر آباد، دکن کے دار الترجمہ میں ناظرِ ادب اور ترقی اردو بورڈ کے شعبۂ لغت کے نگراں اور مدیر اعلیٰ بھی رہ چکے ہیں۔»

«ملی کا قرض» کے اس شعر کے بارے میں ماہر القادری لکھتے ہیں ؎

نقش دستِ آذر ہے
بت بھی ہے آذر بھی ہے

صحیح املا «آزر» ہے۔ «آذر» فارسی میں آگ لگنے کو کہتے ہیں۔ فارسی شاعری میں «بتانِ آذری» کی جو ترکیب ملتی ہے۔ اس سے «بتان پارسی» مراد ہیں، حضرت ابراہیم کے والد یا چچا آذر نہیں۔ آزر (بت فروش) تھے، آزر اور آذر، معنیٰ اور املا کے لحاظ سے ایک جیسے نہیں۔

تراکیب

تراکیب نثر ہو یا شعر میں حسن، اختصار اور اعجاز کی ضامن ہوتی ہیں۔ مستند شعرا اور اہلِ قلم کے یہاں تراکیب کا حسن جابجا بکھرا ہوا ملتا ہے لیکن کبھی کبھی یہ تراکیب «برعکس نہند نام زنگی کافور» کی طرح بھی استعمال ہوجاتی ہیں حکیم کاچیں کرالی نے اس ذیل میں علامہ شبلی نعمانی کے درج ذیل

جملے پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: «ادائے مطلب میں عظیم الشان غلطیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔»

حکیم گلچیں کہتے ہیں کہ «عظیم الشان ہمیشہ اچھے معنی اور اچھے کام کے لئے آتا ہے۔ عظیم الشان کامیابی تو کہہ سکتے ہیں مگر عظیم الشان ناکامی نہیں کہہ سکتے۔» ماہر القادری نے اس پر مختصر حاشیہ لگاتے ہوئے کہا ہے کہ جن موقعوں پر طنز کا محل ہوتا ہے، عظیم الشان ناکامی کہہ سکتے ہیں۔»

اسی کتاب میں حکیم گلچیں نے انیس اور دبیر کے ان دونوں مصرعوں کو واضح اور چست کہا ہے:

دبیر کا مصرع　(رؤیا) میں بھی حسین کو رویا ہی کرتے ہیں
انیس کا مصرع　حسرت ہے کہ خواب میں بھی رویا کیجئے

مولانا اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں: (رؤیا میں رونا) یہ اردو زبان ہی نہیں ہے۔ کیا کوئی اردو میں کہتا ہے کہ میں نے (رؤیا) دیکھا تھا یا کل رات میں رؤیا میں روتا رہا انیس نے خواب میں رونا استعمال کیا ہے۔ ماہر القادری اسے صحیح اردو قرار دیتے ہیں۔

اختر شیرانی اردو کی عزلیہ شاعری میں رومانی شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اردو غزل میں انہوں نے پہلی بار (سلمیٰ) وغیرہ کے نام سے شعر کہے ہیں۔ وہ ایک رند پارسا، عاشق مزاج اور بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کا آخری مجموعۂ کلام (شہرود) ان کی بیگم نے شائع کرایا تھا اور جو ان کی وفات کے بعد ادبی دنیا میں آیا تھا۔ ماہر القادری اس مجموعۂ کلام پر فروری ۱۹۵۰ع میں تبصرہ کرتے ہوئے، اختر شیرانی کے ایک شعر کو نقل کر کے لکھتے ہیں اور اس کے درج ذیل مصرع پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں ع

جہاں کا ذرہ ذرہ درس آزادی دکھاتا ہے

ماہر القادری اسے صحیح اردو نہیں تسلیم کرتے بلکہ اعتراض کرتے ہیں کہ:

"اردو میں درس دینا کہا جاتا ہے، درس سکھانا نہیں" ایک اور شعر کے مصرع "کملائے لگی ضیا قمر کی" کے بارے میں ماہر القادری کہتے ہیں کہ "روشنی کا کملانا، پہلی بار نظر سے گذرا" وہ مزید لکھتے ہیں: "کملانا" فعل لازم ہے جو پھولوں کے مرجھانے یا پھولوں کے نکسنے کے معنی میں شعرا نے استعمال کیا ہے ۔

سایۂ مژگاں میں رکھ ہر لخت دل کو چشم تر سے
یہ گـــل بـاغ محبت، دیکھ کملاویں نہیں (نصیر)

کیا دیکھ لیا، اس چمن حسن کا جلوہ ..!
گل خشک ہیں، کملائے ہیں مرجھائے ہوئے ہیں (مشتری)

مولانا عامر عثمانی، جو ایک علمی، تحقیقی اور دینی ماہنامے "تجلی" کے مدیر اور مشہور اہل قلم کے شعری مجموعے "شاہنامۂ اسلام جدید" پر ماہر القادری نے "فاران" نومبر ۱۹۵۲ ع میں تبصرہ کیا ہے۔ ماہر القادری نے ان کی عالمانہ، شاعرانہ، ادیبانہ اور محققانہ حیثیت کا ذکر نہایت خوش آئند انداز میں کیا ہے کہ "شاہنامۂ اسلام جدید، عامـــر عثمانی کے زور قلم اور قادر الکلامی اور شعـــری صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک آکر ختم ہوجاتا ہے اور مولانا عامر عثمانی کا "شاہنامۂ اسلام جدید" حضور کی وفات سے شروع ہوتا ہے۔ ماہر القادری نے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ "اسلامی تاریخ کے یہ وہ تابناک اوراق ہیں جن پر کسی شاعر نے اس انداز میں اب تک توجہ نہیں کی ہے" یہ سعادت عامر عثمانی کے حصے میں آئی واقعات کی جزئیات تک کو بیان کیا ہے اور جھول پیدا ہونے نہیں دیا ہے۔ ایک ایک شعر سے خشیت الہی، عشق رسول، عظمت صحابہ اور اسلام سے شغف جھلکتا ہے۔ اثر انگیزی کا یہ عالم ہے کہ مجھ پتھر دل کی آنکھیں بھی اشکوں کی روانی کو نہ روک سکیں۔ بے دلی کی نمازیں چاہے منہ پر پھینک دی جائیں مگر عشق رسول میں جو آنسو نکل آتے ہیں، شاید وہ سبب مغفرت اور ذریعۂ نجات بن جائیں۔

اس زوردار خراج تحسین کے بعد ماہر نے اپنے مخصوص انداز میں جستہ

جستہ اشعار پر مدلل تبصرہ بھی کیا ہے، اور ذیل کے شعر پر نقد بھی کیا ہے ؎

معمار تھے، جو مستقبل کے، روتے ہیں گذشتہ عظمت کو
بے باک تھی جن کی بت شکنی، ہنستے ہیں انہیں پتھر کے صنم

ماہر نے اظہار اور بیان کی خامی اور زبان کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے کہا ہے کہ (ہنستے ہیں انہیں) بولا نہیں جاتا۔ شعر کی نثر کی جائے تو (دیکھ کر) کا ٹکڑا اضافہ کرنا پڑے گا۔ (میں انہیں روتا ہوں) تو بولتے ہیں، مگر (میں انہیں ہنستا ہوں) نہیں بولا جاتا ہے ایک اور شعر نقل کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں ؎

بنامِ ربِ کعبہ ایک مشعل لے کے نکلا ہوں
بہت چھوٹی سی شمع نامکمل لے کے نکلا ہوں

ماہر فرماتے ہیں۔ (شمعِ نامکمل) موزوں اور حسین ترکیب نہیں ہے مشعل کے قافیہ کے سبب شاعر کو یہ ترکیب تراشنی پڑی

اردو کے مشہور و ممتاز اسلام پسند ادیب مولانا اسعد گیلانی کے شہرہ آفاق تاثراتی ناول (جہنم کے دروازوں پر) بھی ماہر القادری نے اپنے مخصوص عالمانہ اور بصیرت افروز انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ ناول کے (ص ٦١) کے ایک جملے کو نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مصنف نے لکھا ہے کہ «آسمان پر بادلوں کا گہرا غلاف، ایک خوفناک تاریکی کو زمین کی طرف انڈیل رہا تھا ...» (تاریکی کو انڈیلنا) آج تک نہ آنکھوں نے پڑھا، نہ کانوں نے سنا۔ ایسی باتیں تو نام نہاد (ترقی پسندوں) کو ہی زیب دیتی ہیں۔»

ماہر القادری نے اردو نثر نگاری کے ان باریک اور اہم نکتوں تک کو نظر انداز نہیں کیا ہے جن سے نثر، نثر ہوتی ہے اس میں روانی، فصاحت، بلاغت اور معنویت کا حسن پیدا ہوتا ہے اس سلسلے میں انہوں نے حروف صلات پر بھی بحث کی ہے۔ میں۔ سے۔ کو۔ پر۔ تک۔، یہ حروف صلات ہیں جن سے ایک طرف تو جملے مربوط و ہم آہنگ ہوتے ہیں تو دوسری طرف ان کے صحیح استعمال سے صحیح معنی پیدا ہوتے ہیں اسی ناول کے درج ذیل جملہ کو نقل کرتے ہوئے،

حرفِ صلہ کے غلط استعمال سے جو خرابی واقع ہوتی ہے اس کی طرف وہ اس طرح توجہ دلاتے ہیں:

ایک دکان سے جاکر کھانا نکلا۔ یہاں (سے) کی جگہ (پر) آنا چاہئیے۔
ٹانگوں میں پھڑپھڑاتی ہوئی ساڑیاں۔

ماہر فرماتے ہیں کہ پھڑپھڑانا تو جاندار کی صفت ہے۔ ساڑیوں کا پھڑپھڑانا، کیفیت اور مشاہدہ کی عجیب سی ترحماسی ہے، پھڑپھڑانا میں گھٹن اور کرب و انقباض کی کیفیت پنہاں ہے۔ زبان و بیان کے علاوہ اظہار واقعہ کے اعتبار سے بھی اس لفظ کا یہاں استعمال صحیح نہیں ہے۔

(خوابوں کو توڑ پھوڑ کر پریشان نہ کردیں)

ماہر القادری کہتے ہیں کہ یہاں خوابوں کو پریشان نہ کردیں ہی کافی تھا خوابوں کا توڑنا پھوڑنا حشوِ قبیح ہے

بے وقوف کی دم۔

ماہر کہتے ہیں: الو کی دُم بولا جاتا ہے۔

اس طرح مولٰینا نے نثر میں بھی نظم کی طرح حشو و زوائد کو قبیح اور ناپسندیدہ قرار دیکر حسنِ تبصرہ کا نیا انداز اجاگر کیا ہے۔

ص ۱٦۸ کا یہ جملہ «ننھے ننھے گاؤں ریل کی لائن سے دور دور ملبے کے انبار نظـــر آتے ہیں۔» نقل کر کے ماہر صحیح جملہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔ «چھوٹے چھوٹے گاؤں» درست ہے۔

ص ۳۰۴ کے جملے (ایک لہر گمشدگی بڑھی) کے بارے میں توجہ دلاتے ہیں۔ (موجِ گمشدگی) لکھنا چاہئیے تھا۔ (گمشدگی) فارسی لفظ کے ساتھ لہر (اردو) کی اضافت درست نہیں۔ تراکیب کے بارے میں مولٰینا نے اپنے اسی تبصرے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ قابل غور ہے

طالب علم، ادیب اور شاعر و نثر نگار اس پر دھیان دیں۔

«ترقی پسند اپنی نظم و نثر کے الجھاؤ، ابہال اور بے معنی اشاریت کے سبب ناکام ہوچکے ہیں۔ ان کی تقلید اس تصور کے ساتھ کرنا، کہ لاؤ انہی کے ہتھیاروں سے ان کی کاٹ کریں خطرناک قسم کا اقــــدام ہے جس میں نفع کم، نقصان زیادہ ہے پھر ان ترقی پسندوں کے ہتھیاروں کا یہ عالم ہے کہ استرے سے کھیتوں میں گھانس کھرچنے کا کام لیتے ہیں تلوار سے قلم بنانا چاہتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں۔ کہ چاقو کے پھل میں کسی طرح کدال کا لوہا فٹ ہوجائے۔»

اردو کے صاحب طرز مزاح نگار شوکت تھانوی کی کتاب «جوڑ توڑ» پر بھی ماہر القادری نے تبصرہ کیا ہے شوکت تھانوی کو اردو زبان پر عبور حاصل تھا۔ بڑی حد تک معیاری روزمرہ زبان لکھتے تھے۔ تحریر بڑی شگفتہ، برمحل اور پر لطف تھی بہت سارے لوگوں نے شوکت تھانوی کے ناولوں اور ان کی کتابوں سے صحیح اردو زبان سیکھی کی ہے۔ ماہر القادری نے شوکت تھانوی کی اردو پر بھی تبصرہ کیا ہے اور مذکورہ کتاب میں شوکت تھانوی کے درج ذیل جملے «جو آنکھوں سے کاجل نکال لینے میں قــــدرت رکھتے ہیں» کے بارے میں یوں توجہ دلاتے ہیں آنکھوں میں سے کاجل چرانا کہا جاتا ہے۔ اس پہلو سے حضر کا شعر بھی دیکھتے چلیں ــــــه

بلائیں، حور طفــل رشک چشم سرمہ ساں تیری
کہ آنکھوں میں سے کاجل دیکھ یہ پیہم چراتے ہیں

ماہر القادری صاحب نے فیض احمد فیض کی شاعری اور زبان کے استعمال پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ع وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اترائے

پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ‹بناؤ› کی جگہ، ‹بناوٹ› موزوں تر لفظ ہے۔ فیض صاحب ‹بناؤ اور گھماؤ› کو بری طرح شعر میں استعمال کرتے ہیں فیض

کی مشہور نظم (اے روشنیوں کے شہر) کے بارے میں ماہر القادری نے بے باکی سے اپنی رائے یوں دی ہے:

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے، پھیکی زرد، دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے، تنہائی کا زہر
دور افق تھا، گھٹتی، بڑھتی، گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق، دردوں کی گدلی لہر

"دھوپ کے سوکھنے" سے آخر شاعر کی کیا مراد ہے کیا دھوپ بھیگا بھی کرتی ہے۔ آخری مصرع میں درد کی جمع (دردوں) اردو میں نہیں آتی۔ پھر (دردوں کی گدلی لہر) کیا ہوتی ہے مہمل ترکیب۔ کیا درد کی لہر دکھائی دیتی ہے جو گدلی ہوکر کہر کی مانند بے رونق ہوگئی ہے

مولانا کا رسالہ (فاران) ایک رسالہ نہیں ذہن و فکر کا ایک مدرسہ اور ایک دبستان تھا۔ جس سے ادب کے مبتدی اور منتہی دونوں جلا پاتے تھے، ان کا مستقل کالم ہماری نظر میں علم، زبان، شعر، ادب، سائنس، معاشیات، دین، فکر و فن، سیاست کا انسائیکلوپیڈیا ہوتا تھا۔ انہوں نے اس ذیل میں جو کچھ لکھا تھا وہ کل کے لئے بھی مشعلِ راہ تھا اور آنے والے زمانے میں اردو زبان و ادب کے متلاشیوں کے لئے روشنی کا مینار ہے۔ کتابوں پر انہوں نے جو تبصرے کئے ہیں وہ ناقابلِ فراموش کارنامہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے بے شمار تبصروں میں سے ایسے اہم علمی تبصرے کتابی صورت میں اربابِ ادب کے سامنے لائے جائیں جس میں زبان و ادب کے علاوہ علمی گہرائی اور تجزیاتی شعور کی عظمت موجود ہے۔

•

خاندیش کا ایک نامور دانشور

از

پروفیسر اکبر رحمانی، جلگاؤں (مہاراشٹرہ)

ناظر انصاری ۹ نومبر ۱۹۰۹ع کو نصیر آباد (مشرقی خاندیش) میں ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سینٹرل اُردو مدرسہ نصیر آباد میں حاصل کی۔ ورناکولر فائنل کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۲۸۔۱۹۲۷ع میں اُردو نارمل اسکول امراوتی میں طریقۂ تعلیم کی فنی تربیت حاصل کی اس کے بعد کھنڈوہ (مدھیہ پردیش) میں مدرسی کے فرائض انجام دیے۔ وہاں سے مستعفی ہوکر ۸ دسمبر ۱۹۳۰ع کو میونسپل اردو اسکول جلگاؤں میں ملازمت اختیار کرلی۔ ۴۱۔۱۹۴۰ع میں اردو ٹیچرز ٹریننگ کالج پونا سے بی. ٹی. سی. کا امتحان پاس کیا۔ ترقی کرتے کرتے وہ ایک بڑے اُردو مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر پہنچے اور ۱۹٦۷ع میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد مالیگاؤں جاکر آباد ہوگئے اور وہیں یکم اپریل ۱۹۷۳ع کو انہوں نے وفات پائی۔

ناظر انصاری کا تعلق ایک غریب اور نجیب خاندان سے تھا۔ مفلسی اور غربت نے مرتے دم تک پیچھا نہ چھوڑا نعمت پورہ مسجد کے پاس ایک تنگ و تاریک مکان میں رہتے تھے۔ مطالعہ کا بچپن سے شوق تھا۔ کئی اخبارات ورسائل کی ایجنسیاں ان کے پاس تھیں لیکن ان سے آمدنی کم ہوتی تھی۔ ادبی ذوق کی تسکین زیادہ اس طرح انہوں نے تعلیم یافتہ طبقے میں مطالعۂ کتب بینی کا شوق اور ادبی ذوق پیدا کیا۔ جلگاؤں میں ادبی نشستوں، مشاعروں اور ادبی کانفرسوں کے انعقاد میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اگر یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جلگاؤں (مشرقی خاندیش) کی ادبی سرگرمیاں انہیں کے دم سے تھیں

ناظر انصاری کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا اُن کے بڑے بھائی محمد یٰسین مضمر، نصیر ابادی ایک اچھے شاعر تھے اُن کا کلام جلوۂ یار میرٹھ میں چھپتا تھا۔ وظیفہ یاب صدر مدرس تھے۔ پاکیزہ اور صاف ستھرا مذاقِ سخن رکھتے تھے میر، غالب، حالی، انیس، داغ، امیر اور اقبال کی شعری تصانیف

اُن کے زیر مطالعہ رہتی تھیں ان عظیم شعرا کے اکثر اشعار اُن کے حافظے میں محفوظ تھے کلام انیس کا تو انھیں گہرا عرفان تھا ناظر انصاری لکھتے ہیں : «ہمارے وطن نصیر آباد (مشرقی خاندیش) میں مجالس محرم منعقد ہوتی تھیں۔ اُن میں وہ مراثی اور اُن کے احرا تحت اللفظ سناتے تو فضا کیف و تاثر میں غرق ہوجاتی تھی اور رقت انگیز کیفیات کے باعث مجلس پر سکتہ طاری ہوجاتا تھا »[1]

ناظر انصاری اپنے بھائی کی عدم موجودگی میں انیس کے سلام اور داغ کی غزلیں پڑھتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ «مراثی سے زیادہ مجھے انیس کے سلاموں میں لطف و دلکشی محسوس ہوتی تھی کلامِ انیس میں زبان کی شیرینی و حلاوت، طرز ادا کی دلکشی اور انداز بیان کی لطافت مجھے بے حد مرعوب رہی اُن کی فکری کاوشوں اور فنی محاسن سے حظ اندوز ہوتا رہا ہوں »[2]

انھیں بچپن ہی میں انیس اور داغ کے بہت سے اشعار حفظ ہوگئے تھے۔ جب وہ اُردو نارمل اسکول امراوتی میں فن طریقۂ تعلیم کی تربیت حاصل کرنے داخل ہوئے تو وہاں اردو شعر و ادب کا ذوق اور پروان چڑھا۔ وہاں انھیں نامور ماہر تعلیم اور اُردو کے اُستاد مولوی محمد سلیم (مصنف اُردو کیسے پڑھائیں) کی رہنمائی و شفقت حاصل ہوئی۔ انھوں نے نہ صرف اس جوہر قابل کی خصوصی تعلیم و تربیت کی بلکہ اُس کی مخفی شعری و نثری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لئے مواقع بھی فراہم کیے۔ انھوں نے ناظر انصاری کو درسگاہ کی بزم مباحثہ کا ناظم بنا دیا درسگاہ کے ادبی و تعلیمی رسالے بہارستان کی مجلسِ ادارت میں شامل کیا۔ بہارستان میں اُن کے تعلیمی و ادبی مضامین شائع ہوئے

ناظر انصاری نے ہر مبتدی شاعر کی طرح غزل سے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ وہ لکھتے ہیں، «اساتذہ میں مولانا محمد سلیم (استاد ادبیاتِ اُردو) نے اس ذوق میں میری رہنمائی فرمائی تھی۔ اپنے اسکول کے مشاعروں کے علاوہ کنگ ایڈورڈ کالج اور عثمانیہ ہائی اسکول کے مشاعروں میں بھی شرکت کرتا تھا۔ چنانچہ

۱) آہنگ ادب — ناظر انصاری، ۱۹۶۷ء، ص ۳۷ ۲) ایضاً، ص ۳۷-۳۸

شرف الدین شرف اور شرار ایلچپوری کو اُس زمانے سے جانتا ہوں۔ سید حسین صاحب نارمل اسکول کے صدرِ اعلیٰ اور خواجہ لطیف احمد عثمانیہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے ...... مولانا محمد سلیم صاحب مضمون نویسی کی شاہراہ میں میری رہنمائی اور ساتھ ہی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ وہیں میرا یہ ذوق پروان چڑھتا گیا اور زبان و ادب کی نشو و نما ہوتی گئی۔" [1]

اگرچہ ناظر انصاری نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی لیکن اُن کا رجحان نظم گوئی کی طرف زیادہ تھا انھوں نے مرثیے بھی لکھے اور سلام بھی۔ اُس زمانے میں خاندیش میں مشاعروں اور طرحی نشستوں کی دھوم تھی حضرت نوح ناروی، علامہ سیماب اکبر آبادی، جلیل مانکپوری، اطہر جلگانوی اور علامہ محوی صدیقی کے کئی تلامذہ اس علاقے میں سرگرم عمل تھے غزل مقبول عام صنف تھی۔ ناظر انصاری نے استاد الشعرا حضرت علامہ محوی صدیقی لکھنوی کی شاگردی غالباً ۱۹۳۵ع میں اختیار کی۔ وہ اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں :

"جلگاؤں (خاندیش) کے اُردو مدرسے میں بہ حیثیت مدرس تقرر ہوجانے کے بعد میں نے حضرت علامہ محوی صدیقی لکھنوی کی خدمت میں اپنا کلام بغرض اصلاح روانہ کیا۔ اُس وقت آپ مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو، فارسی، عربی میں لکچرر تھے علامہ نے مجھے استادانہ شفقت سے نوازا۔" [2] اُستاد کامل کے مل جانے سے ناظر کے کلام میں روانی، فصاحت اور تاثیر پیدا ہوگئی

جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں کہ ہر مبتدی شاعر کی طرح ناظر انصاری نے غزل سے اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا۔ ابتدائی کلام کو دیکھنے سے ناظر کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُن کے ابتدائی غزلیہ کلام کا یہ شعر کس قدر پیارا ہے :-

کسی کے حسن کی رنگینیوں کا پوچھنا کیا ہے
اودھ کی شام دیکھی اور بنارس کی سحر میں نے

---

۱) ناظر انصاری سے ایک انٹرویو - ایم صادق، ماخوذ از آہنگ ادب، ص ۲۳۵-۲۳۶

۲) ایضاً، ص ۲۳۶

غزل اگرچہ ان کی پسندیدہ صنف سخن تھی وہ غزل کے آہنگ اور ردیف قافیے کی صوتی خوش آہنگی کے رسیا تھے لیکن انھوں نے نظم نگاری کی طرف بھی توجہ دی اور اس میدان میں وہ کامیاب بھی ہوئے ناظر انصاری کہتے ہیں۔ "آغاز میں غزل کے تاثر سے رومانی نظمیں لکھیں۔ چنانچہ (رنگین نظارے) اور (اے میرے شہر) اس دور کی رومانی نظمیں ہیں، اس کے بعد چونکہ میں اسلامی تاریخ سے بے حد متاثر تھا۔ اس لیے میں نے اسلام کی اکابر و ممتاز ہستیوں کے آثار و باقیات اور واقعات پر مشتمل نظمیں لکھیں۔ . . . . . . اس کے بعد عصری تقاضوں سے متاثر ہوکر (بھوکا ہندوستان) (قحط بنگال) (مشورہ) اور (نیا سویرا) جیسی نظمیں لکھیں کیونکہ ہر شاعر کے نزدیک زندگی کا کوئی واضح نظریہ یقینی طور پر ہونا چاہیے ورنہ اُس کی تخلیقی صلاحیتوں میں نئے تصورات کا اُبھرنا اور نکھرنا مشکل ہوجاتا ہے۔" [1]

غزل اور نظم دونوں میں انھیں مہارت حاصل ہوگئی۔ علامہ محوی صدیقی کی رہنمائی اور اُن کے پاکیزہ و اعلیٰ ادبی ذوق نے اُن کی شاعری کو فنی خامیوں سے پاک کرکے درجۂ معیار و کمال پر پہنچا دیا۔ ملک کے معیاری ادبی جرائد میں اُن کا کلام شائع ہونے لگا۔ اپنے شاگرد کی ترقی دیکھ کر علامہ محوی صدیقی بھی بہت خوش ہوتے تھے اور ناظــــر انصاری کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ وہ اپنے شاگرد کی معاشی پریشانیوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور کہیں نہ کہیں سے مالی انتظام کردیا کرتے تھے۔

ناظر انصاری کا پہلا شعری مجموعہ (خیابانِ تاریخ) ہے جو ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا اس کا "اصلاحی" پیش لفظ علامہ محوی صدیقی لکھنوی نے لکھا تھا۔ انھوں نے اپنے شاگرد کی اس کتاب پر خوشی و مسرت کا اظہار کیا اور یہ دعا کی تھی "یہ چھوٹی سی کتاب، بر چہ بقامت کہتر بقیمت بہتر، کے مصداق ملک میں خوب مقبول ہو۔" [2]

اُردو میں تاریخی نظمیں بہت کم لکھی گئیں علامـــہ شبلی نعمانی نے بقول

---

۱) ناظر انصاری سے ایک انٹرویو۔ ایم صادق، ماخوذ از آہنگ ادب، ص ۲۲۶۔۲۲۷

۲) خیابانِ تاریخ، پیش لفظ، ص ۱۷

محوی صدیقی — "اسلامی تاریخ کے بعض انمول جواہر نظم کرکے پیش کیے اور اپنی شاعرانہ قوت و کمال سے رنگ بھرا کہ یہ تاریخی نظمیں ملک میں بے حد مقبول و مرغوب ہوئیں بعض اور شعرا نے بھی ان کی مقبولیت دیکھ کر کبھی کبھی کسی تاریخی واقعہ پر طبع آزمائی کی مگر مستقل طور پر اس صنف کو اختیار نہ کیا نہ اب تک کسی شاعر کی تاریخی نظموں کا کوئی مجموعہ منظر عام پر آیا۔ .... علامہ شبلی کے بعد اس صنف کا سب سے پہلا نوجوان شاعر اب تک ایک ہی نظر آیا جس کا نام غلام محمد اور تخلص ناظر ہے .... غزلیں بھی کہتے اور دوسری قسم کی نظمیں بھی۔ لیکن ان کی فکر سخن کا خاص موضوع تاریخ اسلامی ہے اور میرا اندازہ یہ ہے کہ ان میں اس کی خاص صلاحیت ہے۔ ان کی فکر میں زور، بیان میں جوش و ولولہ ہے مرثیہ خوانی سے دور اور جوانوں میں ولولۂ حیات پیدا کرنا مقصود شاعری ہے۔ میری رائے ہے کہ اُن کو اپنی شاعرانہ فکر کا مرکز و محور مستقل طور پر اسی صنف کو بنانا چاہیے انشاءاللہ اس میں وہ بہت اچھی ترقی کریں گے دنیائے شاعری میں درجۂ امتیاز و خصوصیت کے مالک ہوں گے "[1] محوی صدیقی چاہتے ہوے کہ ناظر انصاری اسی صنف پر اپنی فکر و توجہ زیادہ مبذول و مرکوز رکھیں۔ وہ کہتے ہیں "کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ نے اسی خاص کام کے لیے اُنھیں چن لیا ہو میرے اس خیال، اُمید اور آرزو کو پورا کرنا اب ان کا فرض ہے "[2] آخر میں اپنی خوشی و مسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"مجھے نہایت درجہ خوشی ہے کہ ناظر کی تاریخی نظموں کا مجموعہ[3] 'خیابان تاریخ' کے نام سے شائع ہورہا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اردو زبان کی تاریخ میں تاریخی نظموں کا پہلا مجموعہ یہی ہے۔ ورنہ اب تک اردو کا وسیع دامن ان سدا بہار پھولوں سے تقریباً خالی تھا یعنی کوئی ایسا مجموعہ مستقل نہیں چھپا

۱) خیابان تاریخ ص ۱۴ تا ۱۶ ۲) ایضاً، ص ۱۷

۳) وہیں محوی صدیقی نے خیابان تاریخ، ناظر انصاری کی تاریخی نظموں کا دوسرا مجموعہ تحریر کیا ہے جو درست نہیں ہے۔ یہی ایک مجموعہ شائع ہوا اس کے بعد ناظر کا کوئی دوسرا مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

بعض دور جدید کے شعرا کے مجموعوں میں ضرور کچھ تاریخی نظمیں ملیں گی ۔[1]

ناظر انصاری کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے نے جو کاغذات راقم الحروف کو دیے تھے اُن میں ناظر انصاری کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی ایک فہرست بھی تھی۔ یہ فہرست انھوں نے قیام مالیگاؤں کے دوران ۲۸ اپریل ۱۹۷۱ ع کو تیار کی تھی اس فہرست میں دو شعری مجموعوں کا ذکر ملتا ہے جو مخطوطات کی شکل میں تھے ، یعنی غیر مطبوعہ تھے ان میں ایک مجموعہ غزلوں اور جدید نظموں کا تھا اور دوسرا سلاموں کا مجموعہ ”ندائے کربلا“ تھا افسوس کہ یہ دونوں مجموعے شائع نہ ہوئے اور اب ان مسودوں کا پتہ نہیں چلتا ۔ راقم الحروف نے بہت کوشش کی کہ اگر مل جائیں تو اُن کی اشاعت کے لیے کوشش کی جائے ۔

ناظر انصاری کو اپنے وطن نصیر آباد سے بہت محبت تھی۔ ”خیابان تاریخ“ میں اُنھوں نے اپنے وطن[2] کی تعریف میں ایک نظم لکھی ہے جس کے چند بند ملاحظہ کیجیے ؎

اس قصبے کو تعلق شاہ نصیر سے ہے　　ویرانہ ہو رہا ہے لیکن یہ آج ہے ہے
جو کر چکا ہے ناظر ! صدیوں کی منزلیں طے　　دیکھے ہیں زندگی میں اُس نے بھی بہمن و دے
”میرا وطن یہی ہے ، میرا وطن یہی ہے“

فاروقیوں کا اس کو ہے یاد وہ زمانہ　　اب تک نگاہ میں ہے وہ شوکت شہانہ
ہے اُس کو یاد اُن کی عظمت کا ہر فسانہ　　ویرانہ بن چکا ہے گو اب یہ آشیانہ
”میرا وطن یہی ہے ، میرا وطن یہی ہے“

گنج شہیداں اس کا اسلام کی نشانی　　یہ مرد جانتے تھے ہر رمز زندگانی
اسلام پر فدا کی ہر اک نے یوں جوانی　　بدر و حنین کی پھر تازہ ہوئی کہانی
”میرا وطن یہی ہے ، میرا وطن یہی ہے“

مشہور ہو چکی ہے ہر جا یہاں کی صنعت　　رفعت کی منزلوں کو طے کر چکی ہے حرفت

۱) خیابان تاریخ ، پیش لفظ ، محوی صدیقی ، ص ۱۶　　۲) ایضاً ، ص ۴۷-۴۸

سب کے دلوں میں باہم تھی جاگزیں صداقت تھی آنکھ میں مروت اور دل میں تھی محبت
"میرا وطن یہی ہے ، میرا وطن یہی ہے"

انھوں نے اچھی غزلیں بھی کہیں ہیں . یہاں ہم اُن کی غزلوں کے چند اشعار دے رہے ہیں ؎

عشق ، عظمت مقام ہے اب تک عقل انساں کی خام ہے اب تک
ورد لب اُن کا نام ہے اب تک شغل یہ صبح و شام ہے اب تک
خواہش دید ہی نہیں ورنہ جلوۂ یار عام ہے اب تک
رحم آتا ہے ابن آدم پر خواہشوں کا غلام ہے اب تک
ہے یہ اعجاز مست آنکھوں کا شغل مینا و جام ہے اب تک [1]

اپنی ہستی کا جو ناظر اُسے عرفاں ہوجائے ہے جو اک قطرۂ ناچیز وہ طوفاں ہوجائے
فیض ساقی سے نہ محروم کوئی رند رہے میکدے میں جو مساوات کا ساماں ہوجائے
مہک اٹھے تری کوشش سے گلستان وطن پھر ترے خون کے چھینٹوں سے بہاراں ہوجائے [2]

ناظر نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ قطعات اور رباعیاں بھی کہی ہیں

ناظر انصاری ایک قادرالکلام شاعر ہونے کے علاوہ ایک بلندپایہ نثر نگار بھی تھے ۔ انھوں نے معلوماتی مضامین بھی لکھے اور تنقیدی مضامین بھی ۔ تاریخی و ادبی مضامین بھی لکھے اور تعلیمی بھی ۔ افسانے بھی لکھے اور انشائیے بھی ۔ اُردو کے علاوہ ہندی اور مراٹھی زبانوں میں بھی انھیں مہارت حاصل تھی ۔ انھوں نے ہندی اور مراٹھی زبانوں کے تقریباً ۱۵۰ افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا جو ہند و پاک کے رسائل میں شائع ہوچکے ہیں [3] انھوں ہندی کے بعض یک بابی ڈراموں کا بھی ترجمہ کیا تھا اور چند طبع زاد ڈرامے رسائل میں ملتے ہیں .

---

۱) ہفت روزہ جلگاؤں ٹائمز ، مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۷۸ ع ، ص ۱
۲) پندرہ روزہ جلگاؤں ٹائمز ، ۱۵ دسمبر ۱۹۷۸ ع ص ۲
۳) ناظر انصاری سے ایک انٹرویو ، آہنگ ادب ، ص ۲۲۹

ناطـــر انصاری کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ «آہنگ ادب» کے نام سے ۱۹٦۷ء میں شائع ہوا تھا۔ علوی پریس بھوپال میں اس کی طباعت ہوئی تھی ۲۴۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت ساڑھے تین روپے تھی اس کا پیش لفظ اردو کے مشہور شاعـــر و نقاد ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا تھا اور ممتاز ادیب و محقق پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے «تبصرہ» کیا تھا

«آہنگ ادب» میں کل گیارہ مضامین ہیں اِن میں سے ایک سیدہ انیس فاطمہ بریلوی کی کتاب «ادب منزل بہ منزل» پر تبصرہ ہے اور ایک «ناظر انصاری سے ایک انٹرویو» ہے جو اُن کی حیات میں ڈاکٹر رحمانی اور ایم صادق نے لیا تھا۔ دیگر جو (۹) مضامین ہیں جو ہند و پاک کے معیاری ادبی رسائل میں چھپ چکے ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے :

(۱) سراج اورنگ آبادی (۲) یادگار انیس — اس عنوان کے تحت اَنیس کی مرثیہ نگاری، رزمیہ نگاری، رباعیات، منظر نگاری، غزل گوئی اور شاعرانہ تعلّی پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ (۳) جدید ادب کا امام حالی (۴) کلام اقبال میں طنز و ظـــرافت (۵) مجاز لکھنوی (٦) کلام جگر میں عصری رجحانات (۷) علامہ محـــوی صدیقی لکھنوی (۸) آں جہانـــی، تلوک چند محـــروم (۹) اختر الایمان اور یادیں۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے «پیش لفظ» میں ناظر انصاری کی تنقید نگاری کے بارے میں نہایت بلیغ رائے دی ہے وہ لکھتے ہیں۔

«ناظر صاحب چونکہ خود بھی ایک معلم ہیں اور انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ تعلیم وتدریس میں صرف کیا ہے اس لیے اپنے موضوع کی طرف اُن کا رویہ عام طور پر توضیح و تشریح، تعبیر و ترجمانی اور افہام وتفہیم کا رہا ہے۔ وہ ایک ذہین اور تجربہ کار استاد کی طرح زیر بحث شاعر کے بارے میں محض رائے دینے یا محاکمہ کرنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ اس سے متعلق بعض بنیادی اور اہم معلومات کا فراہم کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں تاکہ شاعـــر مذکور کے کلام کی

خصوصیات کے لیے ایک مناسب پس منظر تیار ہوسکے۔ اور آگے چل کر جو کچھ کہا جائے اُس کے سلسلے میں کسی طرح کے ابہام یا پیچیدگی کو راہ نہ ملے "[1]

بقول عبدالقوی دسنوی :

"یہ بڑی اچھی بات ہے کہ انھوں (ناظر انصاری) نے زیادہ تر ایسے شعرا کو اپنا موضوع بنایا ہے جن پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جن پر تنقیدی مضامین لکھنے کی بے حد ضرورت ہے۔ جناب ناظر انصاری صاحب کی تحریر میں سادگی اور صفائی ہے وہ اپنی بات قاری کے ذہن و دماغ میں آسانی سے اُتار دیتے ہیں۔ طریقۂ استدلال بھی سلجھا ہوا ہے "[2]

ناظر انصاری نے اپنے انٹرویو میں "آہنگ ادب" کے علاوہ مضامین کے دو اور مجموعے کے ترتیب دیے جانے کا ذکر کیا ہے [3] اور اُن کے نام "نگار ادب" اور "بساط ادب" بتائے ہیں لیکن انھوں نے غیر مطبوعہ کتابوں کی فہرست میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ شاید ان کتابوں کے نام بدل دیے تھے۔ فہرست مذکورہ میں ان کے نام- "نیرنگ ادب" اور "نقوش ادب" تحریر کیے گئے ہیں علاوہ ازیں اس فہرست میں مجاز کی حیات اور فکر و فن پر "در مجاز"[4]، غالب کی شخصیت اور شاعری پر "غالب نکتہ داں" اور غزل کے موضوع پر مختلف رسائل سے منتخب شدہ مقالات کا مجموعہ "مضامین غزل" کا ذکر ملتا ہے۔

مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی اس فہرست میں افسانوں کے مجموعے "واپسی اور دوسرے افسانے" کا بھی ذکر ہے لیکن اس کے بارے میں ناظر انصاری کا یہ بیان بھی اُس فہرست میں لکھا ہوا ہے کہ "اس کتاب کے دس بارہ افسانوں کو فراہم کرنا پھر اُنھیں کتابی شکل میں تحریر کرنا بڑا محنت کا کام ہے " اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ افسانوی مجموعہ انھوں نے مرتب نہیں کیا تھا "مضامین غزل"

۱) آہنگ ادب، ص ۱۸-۱۹ ۲) ایضاً، ص ۲۱-۲۲ ۳) آہنگ ادب، ص ۲۳۹

۴) ناظر انصاری نے اپنے انٹرویو میں اس کتاب کے بارے میں کہا تھا کہ دہلی سے شائع ہو رہی ہے لیکن وہ شائع نہ ہوسکی۔ غالباً اس کتاب کا مسودہ جگن ناتھ آزاد کو بھیجا گیا تھا۔

کے بارے میں انھوں نے اسی مشکل کا ذکر کیا ہے۔ «مضامین غزل، مختلف رسائل سے حاصل کرکے ترتیب دینا بے انتہا مشکل امر ہے۔»

ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد ناظر انصاری نے سلاموں کے ایک مجموعہ اور سات نثری کتابوں، اس طرح کل آٹھ کتابوں کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن وہ تن تنہا ان کتابوں کی اشاعت کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے تھے اس لیے اپنی مجبوریوں کا یوں اظہار کیا۔ «خدائی سرکار سے بڑی رقم ملے اور عزم و حوصلہ عطا ہو تو میری آٹھ کتابیں منظر عام پر آسکتی ہیں» لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور یہ حوصلہ افزا بات لکھی کہ «بہر طور اپنے مقدور بھر اپنی حیثیت کے مطابق میں بھی کوشش کرتا رہوں گا» اگر اُن کی زندگی وفا کرتی تو یقیناً وہ اِن کتابوں کو شائع کرتے اور اُردو ادب میں گراں قدر اضافہ کرتے۔

اِن غیر مطبوعہ کتابوں میں سے مجموعے نیرنگ ادب کا مسودہ نہایت خستہ حالت میں ملا ہے۔ کاغذ جگہ جگہ سے پھٹ رہا ہے اس مسودہ کے ساتھ «نیرنگ ادب» میں شامل تنقیدی مضامین کی فہرست بھی ملی ہے۔ اس کتاب میں کل پندرہ مضامین شامل ہیں۔ ان میں دو مضامین کے بارے میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ انھیں «لکھنا» ہے فہرست مضامین یہ ہے۔

(۱) غالب نکتہ داں (۲) قاضی عبدالغفار اور اُن کا فن (۳) حسرت موہانی کی شاعری (لکھنا باقی) (۴) فانی کا تغزل (۵) اقبال ایک عظیم شاعر اور مفکر (۶) شاعر و مفکر - اقبال کی نظر میں (۷) فیض احمد فیض (۸) جگر - مغنی حیات (۹) شہنشاہ تغزل (۱۰) وامق جونپوری (۱۱) مخدوم محی الدین (۱۲) شاذ تمکنت کا فن (تراشیدہ کی روشنی میں) (۱۳) اُردو غزل میں زلف و گیسو کا تصور (۱۴) علی سردار جعفری کی شاعری (لکھنا باقی)

اس کتاب کا پیش لفظ، اعجاز صدیقی (مدیر ماہنامہ شاعر بمبئی) نے لکھا تھا اور «اظہار حقیقت» کے عنوان سے ڈاکٹر قمر رئیس کی رائے بھی اس میں

شامل تھیں[1] ڈاکٹر ظفر الاسلام ظفر (مصنف نوح ناروی - حیات اور شاعری) نے «کھو دودھ کو دودھ» کے عنوان سے دیباچہ لکھا تھا۔ اس کتاب میں اُردو کے ممتاز ادیب، نقاد، مورخ اور عالم دین علامہ سید سلیمان ندوی کی «تقریظ» اور صاحب طرز انشاء پرداز، ادیب الملک خواجہ محمد شفیع دہلوی کے «تاثرات» بھی شامل تھے۔[2]

علامہ سید سلیمان ندوی نے ناظر انصاری اور اُن کی کتاب کے بارے میں اپنی گراں قدر رائے اگست ۱۹۴۹ء میں دار القضا بھوپال سے بھیجی تھی یہ رائے ۲۰ اگست ۱۹۴۹ء کو موصول ہوئی تھی اصل خط نہ مل سکا۔ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں۔

«کہتے ہیں کہ اُردو زبان جس کو اگر آسان طرز میں لکھا جائے تو ہندوستانی ہے یہ ایک ایسی زبان ہے جو ملک کے ہر گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کی دلیل یہی ہے کہ اُس کے لکھنے والے اور بولنے والے ہر جگہ پائے جاتے ہیں خاندیش جو لکھنو اور دلی سے بہت دور ایک ایسے کونے میں واقع ہے جس کا تعلق سی پی۔ اور بمبئی سے قریب تر ہے پھر بھی اُس میں اُردو کے اچھے لکھنے والے ہیں جن میں سے ایک ناظر انصاری صاحب ہیں جن کے کچھ مضامین کا مجموعہ آپ کے سامنے ہے اس سے معلوم ہوگا کہ اگر اُردو کو ہندوستان کی زبان ہونے کا دعوی ہو تو کچھ بیجا نہیں ہے۔

۱) ایک کاغذ پر مذکورہ فہرست مضامین کے ساتھ پیش لفظ، ڈاکٹر قمر رئیس اور «ایک گراں قدر رائے»، اعجاز صدیقی کا لکھا ہوا ہے۔ (اکبر رحمانی)

۲) سید سلیمان ندوی اور خواجہ محمد شفیع دہلوی کی رائیں کافی پرانی ہیں۔ ابتداء میں ناظر انصاری نے اپنے مضامین کا جو مجموعہ ترتیب دیا تھا اس کا نام «مقالات ناظر انصاری» رکھا تھا اس کتاب پر ان دونوں حضرات نے اپنی رائیں دی تھیں یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ «مقالات ناظر انصاری» میں کون کون سے مضامین شامل تھے۔ لیکن یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ «نیرنگ ادب» کا کوئی مقالہ اُس میں شامل نہیں تھا۔ دراصل ان دو عالموں نے ناظر انصاری کی ادبی خدمات اور نثر نگاری کو سراہا ہے۔ (اکبر رحمانی)

میں نے اس مجموعہ کو جگہ جگہ سے دیکھا اور ناظر صاحب کی کوششوں کو پسند کیا۔ خدا کرے اس مجموعہ سے لوگوں کو فائدہ پہنچے ان کا طرز ادا سادہ ہے زبان سلجھی ہوئی ہے اور دلچسپی سے پڑھنے کے قابل ہے ۔

ادیب الملک خواجہ محمد شفیع دہلوی نے ناظر انصاری کے مضامین اور دلکش اسلوب بیان کی بے حد تعریف کی ہے وہ لکھتے ہیں :

« اس دور طغیان زدہ میں جبکہ بحر ادب میں طوفان بدتمیزی بپا کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔ حد ادب سے بڑھ جانے والے طاغی قلم طراز ، فحش نگاری اور گندہ بیانی سے آبروئے ادب برباد کررہے ہیں مغتنم ہیں وہ ہستیاں جو گرداب سے بچ کر نکل جاتی ہیں ۔ جن کے دامن تر نہیں ہوتے

ناظرین دیکھیں گے کہ ناظر انصاری انہیں چند افراد میں سے ہیں ۔ « مقالات ناظر انصاری » راقم نے پڑھے ان میں عامی کیف اور افسانے کی رنگینی و دلچسپی کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے ۔ ٹھوس باتیں ہیں لیکن طبیعت پر بار نہیں ہوتیں۔ بیان میں آب رواں کی کیفیت ہے جگہ جگہ حسن ادا سطح آب پر کنول کے پھولوں کی سی جھلک دے رہا ہے جگہ جگہ شاعرانہ نزاکتیں اس جانب اشارہ کررہی ہیں کہ قابل مصنف صرف نثر نگار ہی نہیں بلکہ طبع عروس شعر سے ہمکنار ہے جس کے ثبوت میں مصنف کا ایک فقرہ پیش کرتا ہوں :

« وہ سر سید کی ذات گرامی تھی جس نے حالی کو گل و بلبل کے افسانوں ، حسن و عشق کی داستانوں اور کاکل و رخسار کی کہانیوں سے نفرت دلا کر قوم کے خواب غفلت کو توڑنے پر آمادہ کیا ۔ »[1]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ناظر کی نظر گوہر شناس نے جواہر پارہ نکال کر مضمون کو مرصع کیا ہے مقالہ نگار کو اپنے خیالات کو واضح اور شستہ طور پر

---

۱) حالی پر یہ مضمون « آہنگ ادب » میں شامل ہے ۔ (دیکھئے ص ٦٨) ۔ مذکورہ اقتباس اسی مضمون سے ماخوذ ہے ۔ لیکن کتاب میں « خواب غفلت » کی جگہ « طلسم غفلت » تحریر ہے ۔ (ص ٦٩)

سلیس، عام فہم زبان میں بیان کرنے کا خاص ملکہ ہے۔ بات خدا لگتی کہتا ہے۔ دلائل دلنشیں دیتا ہے۔ الفاظ کے ساتھ ساتھ خیالات کانوں کی راہ دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔ یہ خصوصیت مقالہ نگاروں کے لیے ضروری ہے لیکن کم کو نصیب — دیکھا گیا ہے کہ اکثر و بیشتر اپنے ہی خیالات میں خود اُلجھ کر رہ جاتے ہیں اور قاری تک اُن کا ما فی الضمیر نہیں پہنچتا۔

راقم نے ناظر انصاری کے مقالوں میں ایک یہ خصوصیت پائی کہ پہلا ہی فقرہ اس درجہ نظر گیر ہوتا ہے کہ آگے پڑھنے کو آپ سے آپ دل چاہنے لگتا ہے۔ مثلاً (اقبال میری نظر میں) میں فرماتے ہیں:

"ہندوستاں کے افق پر جب حضرت اقبال ہلال بن کر چمکنے اور بڑھتے بڑھتے ماہتاب بن کر ضیا پاشی کرنے لگے، وہ زمانہ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز کا تھا"

یہ اس درجہ حسین فقرہ اور جملہ ہے کہ نگاہیں جم کر رہ جاتی ہیں اور ایک منظر سامنے آجاتا ہے۔ قدرت نے فراخ حوصلگی سے حسن ادا اور طرز بیان قابل مصنف کو ودیعت کیا ہے کہ زبان یہ کہنے پر مجبور ہوجاتی ہے ؎

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

"...... یہ تو نمونہ مشتے از انبارے، کے طور پر ناظرین (مقالات ناظر انصاری) کے رو برو پیش کیا گیا ہے ورنہ ساری کتاب مرصع ہے اور پڑھنے کے قابل "[1]

ممتاز ترقی پسند نقاد ڈاکٹر قمر رئیس نے (نیرنگ ادب) پر جو دیباچہ تحریر کیا ہے وہ غیر مطبوعہ ہے۔ اور اُنہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اس میں ناظر انصاری کی تنقید نگاری کے بارے میں جو بلیغ رائے دی گئی ہے وہ لائق

۱) اس رائے کے نیچے خواجہ محمد شفیع دہلوی کا پتہ (مٹیا محل دہلی) اور تاریخ (یکم جنوری ۱۹۸۶ ع) درج ہے۔ یہ ناظر انصاری کا لکھا ہوا ہے اصل خط ہمیں دیکھنے کو نہیں ملا (اکبر رحمانی)

مطالعہ ہے یہاں ہم اس دیباچہ[1] کو مکمل نقل کر رہے ہیں :

« تنقید کی قسمیں خواہ کتنی ہی ہوں نقاد دو ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا تخاطب دانشوروں اور ادیبوں سے ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو اپنی تحریروں میں ادب کے عام قارئین اور طلبہ کو پیش نظر رکھتے ہیں اول الذکر تنقید میں نئے حقائق، نئی تعبیر، دقیق مسائل اور فلسفیانہ نکات پر زور دیتے ہیں جبکہ موخر الذکر ادب کی تفہیم و تعبیر کے ایسے پہلوؤں پر نظر رکھتے اور انھیں ایسی سادگی اور وضاحت سے پیش کرتے ہیں کہ شعر و ادب کا ایک معمولی طالب علم بھی اُن سے مستفید ہوسکے اور اس طرح ادبی تنقید اس کے مذاق کی تہذیب و تشکیل میں حصہ لے سکے۔ ناظر انصاری صاحب ایسے ہی ناقدوں اور ادیبوں کی صف سے تعلق رکھتے ہیں۔ »

« ان کی ساری عمر درس و تدریس کے مشغلہ میں گزری وہ بھی خاندیش جیسے دور افتادہ علاقے کے نیم قصباتی اور غیر ادبی ماحول میں۔ لیکن شعر گوئی کے ذوق، اُردو زبان سے محبت اور شوق مطالعہ نے اُردو کے قدیم و جدید ادب سے ان کا تعلق استوار رکھا اور شعر و ادب کے بارے میں اپنے تاثرات کو اکثر رسائل کی فرمائش یا کسی دوسری تحریک سے ضبط تحریر میں لاتے رہے۔ یہ مجموعہ ان کے ایسے ہی مقالات پر مشتمل ہے۔ مقالات کی فہرست اور موضوعات کے تنوع پر ایک سرسری نظر ڈالیے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادب سے خاص طور پر شغف رکھتے ہیں۔ ادب کی تاریخ پر ان کی نظر ہے نثر اور نظم وہ دونوں کے شیدائی ہیں۔ ادب کی تاریخ کو وہ ایک وحدت یا اکائی کی صورت میں دیکھتے ہیں اور قصہ قدیم و جدید کو حکایت پارینہ مانتے ہیں ورنہ سراج اورنگ آبادی، غالب اور مولانا صہبائی کے پہلو میں اقبال، فیض، جگر اور قاضی عبدالغفار نظر نہ آتے۔ عملی تنقید سے قطع نظر (ادیب کی ذمہ داری) اور (نظم کا طریقۂ تعلیم) جیسے مضامین ادب کے مسائل پر ان کے سنجیدہ غور و فکر اور اُن کے تصورات کے

---

۱) کاغذ کافی بوسیدہ ہے۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔ اسے محفوظ رکھنے کے لیے پورا دیباچہ نقل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ (اکبر رحمانی)

ترقی پسند اور توانا پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ناظر صاحب افہام و تفہیم کی جس سطح کو عزیز رکھتے ہیں اس میں وضاحت اور جامعیت کے لیے دلیلوں سے زیادہ مثالیں اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ اپنے قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں اور اپنی باتیں اس کے ذہن نشین کرانے کے لیے ہر جگہ مناسب مثالیں دیتے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اپنی رائے منوانے یا اس پر زور دینے کے لیے انہیں کسی حکیمانہ تاویل یا تہدید کی ضرورت نہیں پڑتی۔ قاری بالکل غیر شعوری طور پر ان کا ہم خیال ہوتا رہتا ہے اور کبھی کبھی تقریر کی لذت اور سادگی اُسے اس درجہ متاثر کرتی ہے کہ وہ سوچتا ہے (گویا یہ سب میرے دل میں تھا)۔ میں نے بھی یہی سوچا تھا۔

زبان اور اظہار بیان پر ناظر صاحب کو جو قدرت حاصل ہے۔ . . (یہاں سے کاغذ پھٹ گیا ہے) . . . ان کی عبارت میں کہیں بھی ژولیدگی یا پیچیدگی کا گمان نہیں ہوتا۔ صاف روشن خیالات، چھوٹے چھوٹے بے ساختہ جملے، لہجہ کی نرمی اور سنجیدگی اور زبان و بیان کی سلاست۔ ناظر صاحب کی تحریروں میں ہر جگہ قاری کو متاثر کرتی ہے۔

ضبط و توازن کا احساس اور افراط و تفریط سے گریز ناظر صاحب کی تنقید کا سب سے نمایاں وصف ہے۔ جانب داری، تنگ نظری اور کٹر پن کہیں بھی ان کی تنقید میں بار نہیں پاتا اسی طرح اُن کے نظریۂ ادب میں بھی صالح اور صحت مند قدروں کا احترام نمایاں نظر آتا ہے وہ تخلیقی اظہار اور شعر و ادب کے جمالیاتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ افکار و خیالات کی گہرائی اور بلندی پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ فیض کے کمال فن کی داد دینے کے بعد وہ زبان و بیان میں ان کے تسامحات کو سامنے لانے سے نہیں چوکتے الغرض ایک معقول اور متوازن انداز نظر اُن کی اکثر تنقیدوں کو ایک معروضی اور علمی وقار بخش دیتا ہے۔ اور یہ وہ اوصاف و عناصر ہیں جن کی بنا پر مجھے اُمید ہے کہ یہ مجموعہ اردو داں حلقہ میں خصوصاً طلبہ کے حلقہ میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ ●

موصول بتاریخ[1] ۴ جنوری ۱۹۶۹ع		قمـــر رئیس
دستخط ناظـــر انصاری، جلگاؤں		شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی

(نیرنگ ادب) کے مسودے میں اعجاز صدیقی کا پیش لفظ تھا بعد میں ناظر انصاری نے ترمیم کی اور ڈاکٹر قمر رئیس کا پیش لفظ لکھا اعجاز صدیقی نے جس مجموعۂ مضامین پر پیش لفظ لکھا تھا اُس کا نام (مصباح ادب) تھا اس میں بھی مضامین وہی تھے جو (نیرنگ ادب) میں شامل تھے۔ (مصباح ادب) کے مسودے میں دو مضامین کا اضافہ تھا۔ (۱) یہ مشاعرے اور (۲) نظم کا طریقۂ تعلیم۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناظر صاحب کتاب کا مناسب نام تلاش نہیں کر پارہے تھے۔ پھر وہ یہ بھی طے نہیں کر پارہے تھے کہ مضامین کے دو مجموعے شائع کروں یا ایک۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی انہوں نے اپنی کتاب کا نام (مقالاتِ ناظر) رکھا، کبھی (نگارِ ادب) تو کبھی (بساطِ ادب) اور (مصباح ادب)۔ ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے اپنی کتاب کا نام (نیرنگ ادب) رکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ناظر انصاری نے اتنے مضامین لکھے کہ تین مجموعے باسانی مرتب ہوسکتے ہیں۔

۱۹۶۲ع میں ناظر انصاری نے شاعر کے ایڈیٹر اعجاز صدیقی سے اُن کے گھر ملاقات کی اور انہیں مضامین کا مسودہ (مصباح ادب) دےکر پیش لفظ لکھنے کی درخواست کی۔ اعجاز صدیقی کا تحریر کردہ اور ناظر انصاری کا نقل کردہ پیش لفظ راقم الحـــروف کو دستیاب ہوا ہے۔ اُس پر (۱۹ فروری ۱۹۶۲ع) کی تاریخ درج ہے۔ اس پیش لفظ کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ اعجاز صدیقی، ناظر انصاری کو نقادوں کی صف میں جگہ نہیں دیتے اُن کی رائے ہے کہ وہ ایک ادیب اور انشاء پرداز ہیں۔ ذیل میں اس پیش لفظ کے چند اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں۔

«مجھے بڑی حیرت ہوئی جب دو مہینے پہلے ایک شام کو ناظـــر انصاری جلگاؤں سے آئے اور انہوں نے رجسٹر سائز کا ایک بھاری مسودہ میرے سامنے

---

۱) اس دیباچہ کے ساتھ ڈاکٹر قمر رئیس کا ایک خط بھی دستیاب ہوا جس پر تاریخ ۲۹ دسمبر ۱۹۶۸ع درج ہے اس خط میں کتاب کا مسودہ اور پیش لفظ بھیجنے کا ذکر ہے۔ (اکبر رحمانی)

رکھتے ہوئے کہا کہ یہ میرے مقالات ہیں میں انہیں چھپوا رہا ہوں اس پر کچھ لکھ دیجے ۔۔۔۔۔ دراصل ناظر انصاری کی دائمی عسرت اور جرأت پر سوچ رہا تھا ناظر انصاری زندگی بھر پریشان رہے ہیں اور کبھی روح فرسا پریشانیوں سے انہیں الگ نہیں پایا وہ ایک مدت سے فکر سخن بھی کرتے ہیں۔ شعر کے معائب و محاسن سے خوب واقف ہیں افسوس کہ اُن کے ماحول نے اُنہیں اُبھرنے نہ دیا اور انہیں وہ وسائل نہ مل سکے جو ایک فنکار کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

کسی حد تک میرے علم میں یہ بات بھی تھی کہ وہ نثر بھی لکھتے ہیں لیکن یہ بالکل اندازہ نہ تھا کہ انہوں نے اتنے بہت سے مضامین لکھ لیے ہوں گے اور نہ یہ وہم و گمان کہ سود و زیاں کے خوف و خیال سے ہٹ کر وہ انہیں کتابی شکل میں چھپوانے کا ارادہ کرلیں گے اس پندرہ بیس منٹ کی ملاقات میں ایسی ہی باتیں سوچتا رہا اور آخر میں جو جذبہ میرے دل میں پیدا ہوا وہ قدر اور پیار کا تھا۔۔۔۔۔۔

ناظر انصاری جلگاؤں (خاندیش) میں ایک مدت سے مقیم ہیں ان کا پیشہ مدرسی ہے۔ جلگاؤں میں شعر و ادب کا وہ ماحول نہیں جو دوسرے متمدن شہروں میں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہاں اُن کے ادبی ذوق کی پذیرائی کے امکانات نہ پہلے تھے اور نہ اب ہیں اُن کے اپنے شہر میں جہاں نہ اُن کی قدر ہوئی نہ اُن کی کاوشوں کو سراہا گیا بلکہ جذبات مخالفت ہی اُبھرتے رہے ایسے ماحول میں لکھتے رہنا واقعی قابل داد ہے جب میں نے اُن کے مضامین پر نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ انہوں نے لکھنے کے لیے کافی پڑھا ہے اور جو کچھ پڑھا ہے اُس کے حاصل سے قاری کو آشنا کرنے کی مستحسن کوشش کی ہے۔

اُن کے اس مجموعۂ مضامین میں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم اور خواجہ محمد شفیع دہلوی کی بہت پرانی رائیں شامل ہیں اُن سے بہ آسانی اس نتیجہ پر پہنچا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی تحریروں سے دس پندرہ سال پہلے علمائے ادب کو متاثر و متوجہ کرچکے تھے۔ میں نے بھی اُن کے مضامین کو جستہ جستہ دیکھا ہے لیکن میں یہ فیصلہ نہیں کرسکا ہوں کہ ناظر انصاری کا شمار کس صف میں کیا جائے۔

یہ مضامین انہیں نقاد کی صف میں تو لاتے نہیں البتہ انہیں ادیب یا انشاء پرداز ضرور کہا جاسکتا ہے۔ اور میرے نزدیک انہیں ایک اچھا انشاء پردار کہنا ہی اُن کے ساتھ انصاف کرنا ہے۔

(صباح ادب) میں کافی طویل مضامین شامل ہیں اور تقریباً سب ہی مطبوعہ ہیں۔ کچھ شخصیات سے متعلق ہیں کچھ اقبالیات اور کچھ تاریخ و سوانح سے۔ مجھے ان کا مضمون (نظم کا طریقۂ تعلیم) جسے وہ اپنے مجموعے میں رکھنا نہیں چاہتے تھے زیادہ پسند آیا یہ موضـــوع کے اعتبار سے کافی اہم ہے اور اس میں انھوں نے اپنے تجربات شامل کرکے اُسے افادی بنا دیا ہے قاضی عبدالغفار پر بھی بڑا سیر حاصل مضمون ہے۔ البتہ فیض پر انھوں نے جوکچھ لکھا ہے اس میں میرے اور دوسروں کے کہنے کی ابھی کافی گنجائش ہے۔ غالب، اقبال اور جگر پر انھوں نے ہر چند عام اور روایتی انداز سے لکھا ہے لیکن ان مضامین سے بھی اُن کی باخبری اور وسیع مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ (یہ مشاعرے) ان کا بہت اچھا معلوماتی مضمون ہے۔ (شاعر) میں شائع ہونے کے بعد اسے کافی پسند کیا گیا اور یہ نقل بھی ہوا تھا۔

ناظر انصاری کی نثر جدید تو نہیں لیکن بے حد شگفتہ، رواں اور اثر انگیز ہے۔ ان کی پختہ مشق اور پختہ کاری سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اردو اور فارسی، ہندی اور مراٹھی زبان میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں اور انھوں نے دوسری زبانوں سے کچھ ترجمے بھی کیے ہیں (مصباح ادب) کے مضامین ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہیں اور ناظر انصاری کی اس کاوش کی داد ملنی چاہیے حالانکہ وہ خود زندگی بھر صلہ و ستائش کی تمنا سے بے نیاز رہے ہیں۔

«وہ ایک ایسا پھول ہیں جو نہ خزاں میں کمھلایا اور نہ بہار میں شگفتہ ہوا»

(نیرنگ ادب) کے لیے رئیس ہائی اسکول بھیونڈی کے سابق پرنسپل ڈاکٹر ظفر الاسلام ظفر مرحوم نے بھی دیباچہ لکھا تھا۔ ڈاکٹر ظفر ادیب اور شاعر ہونے کے علاوہ محقق بھی تھے (حضرت نوح ناروی ـ حیات اور شاعری) پر تحقیقی

مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس دیباچہ کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ ناظر انصاری کی وفات سے ایک ہفتہ[1] قبل ہی تحریر کیا گیا ہے اس دیباچہ کا عنوان ہے (کہو دودھ کو دودھ) ـــ یہ اس قابل ہے کہ اسے پورا نقل کیا جائے ڈاکٹر ظہر الاسلام ظفر لکھتے ہیں۔

" ناظر انصاری اردو کی ابتدائی تعلیم دینے والے مدرسین کے اُس قابل قدر قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جس نے معاشی طور پر آتش زیر پا اور سماجی اعتبار سے پیش پا افتادہ ہوتے ہوئے بھی اپنے وسیع مطالعہ، اپنی علمی دسترس اور اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر اُردو کے ادبی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کیا اس قبیلے میں موصوف اس لحاظ سے ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں کہ اپنی ادبی زندگی کا آغاز شعر و شاعری سے کرنے کے باوجود انھوں نے اصل توجہ نثر پر دی ـــ اور پھر نثر بھی افسانوی نہیں، بلکہ شعر و ادب کی تفہیم و تشریح اور شعراء و ادباء کے کاموں کی چھان بین والی نثر، جس سے عہدہ برآ ہونا تحقیقی ژرف بینی اور تنقیدی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔

(آہنگ ادب) کے بعد (نیرنگ ادب) ناظر صاحب کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے اس کا ہر مضمون اپنے مواد کے لحاظ سے سالہا سال کے وسیع و محتاط مطالعے کا مظہر ہے۔ طرز بیان دلنشیں اور زبان صاف و شستہ ہے۔ اقتباسات کا استعمال بڑی دریا دلی سے کیا گیا ہے جس سے مضامین کی حوالہ جاتی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے اگر حوالہ جات میں کتابوں کے ایڈیشن یا سالِ اشاعت اور جرائد کے ماہ و سال یا جلد و شمارہ کی نشان دہی کر دی جاتی تو اور بھی اچھا ہوتا۔

یوں تو ہر مضمون کافی محنت سے لکھا گیا ہے اور اہلِ ذوق کی معلومات میں اضافے اور تازہ کاری کا ضامن ہے لیکن مجموعہ کا بہترین مقالہ غالباً (قاضی عبدالغفار اور اُن کا فن) ہے اس میں قاضی صاحب کی شخصیت کے خد و خال کو پوری طرح اُبھارنے کا نہ تو امکان ہی تھا اور نہ ایسا کیا جاسکا ہے لیکن فن کا جائزہ کافی دیدہ ریزی سے لیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ مقالہ اُن کی شخصیت،

---

۱) دیباچہ پر ۲۳ مارچ ۱۹۷۳ع کی تاریخ درج ہے۔

اُن کے فن اور اُن کی خدمات کو سمجھنے میں کافی مدد ومعاون معلوم ہوتا ہے۔ ابھی اُس وقت کا انتظار ہے جب قاضی عبدالغفار کے ادبی قدو قامت کا صحیح تعین ہوگا۔

«فانی کا تغزل» بھی اس مجموعے کا کافی جاندار مقالہ ہے۔ فانی کی یاسیت زبانِ زدِ عام ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے یہاں یاس و الم اور غم و حرماں کے سوا بھی بہت کچھ ہے جو اُن کے کلام میں فن کی اعلیٰ قدروں کا ضامن ہے۔ دراصل ہماری اُردو تنقید نگاری میں چند بندھی ٹکی آراء کو بے تامل قبول کرلینے کا رواج بہت عام ہے۔ لوگ کسی مشہور و معروف ناقد کی رائے دیکھ کر مرعوب و مغلوب ہوجاتے ہیں اور پھر اُسی کی دکھائی ہوئی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ کسی وجہ سے ناقد نے غلط رائے تو قائم نہیں کرلی ہے۔ لیکن یہ راہ اختیار کرنے میں دشواری یہ ہوتی ہے کہ شاعر کے پورے کلام کا محتاط مطالعہ کرنے اور پھر کوئی آزادانہ رائے قائم کرنے کی کڑی منزل سامنے آجاتی ہے اس سے بچنے کا آسان نسخہ یہی نظر آتا ہے کہ جو رائے علم و ادب کے متقدر حلقوں میں راسخ ہوچکی ہو اُسی کو اپنا لیا جائے۔

ناظر صاحب کا مقالہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس «تقلیدی» تنقید کا شکار نہیں ہوئے ہیں بلکہ حریت فکر کے ساتھ کلام فانی کے مختلف پہلوؤں اور اجزائے ترکیبی کا جائزہ لیا ہے اور ہر مرحلے پر اپنی ایک رائے قائم کی ہے۔ مجموعی طور پر ناظر صاحب اپنی اس کوشش میں کامیاب ہیں، مگر فانی کو میر و غالب کا درجہ دینے کی دبی سی بھی آواز اٹھانے میں انھیں کافی تامل سے کام لینا چاہیے تھا۔ علامہ اقبال، اُن کی شاعری، اُن کے فکر و فلسفہ اور اُن کے پیغام پر ہماری زبان میں کتابوں کا ایک گراں بہا سرمایہ موجود ہے لیکن اقبالیات کی اس بے پناہ افراط کے باوصف، اس بات کی ضرورت آج بھی ہے کہ اقبال کو اچھی طرح سمجھنے اور سمجھانے کے لیے افہام و تفہیم کے انداز میں ایسے مضامین لکھے جائیں جو ایک اوسط درجے کے قاری کی ذہنی سطح کے مطابق ہوں — اس زاویے سے دیکھا جائے تو علامہ اقبال پر ناظر انصاری کے جو مضامین

اس مجموعے میں شامل ہیں وہ بہت ہی مفید اور کارآمد ہیں۔

تقسیم کے بعد سے پاکستان میں اقبال کو ایک خالص اسلامی شاعر کی حیثیت دینے اور انہیں پاکستان کا معمار اول بتانے کی جو ناروا کوشش کی گئی ہے اُس کے پیش نظر یہ اور بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ عالم انسانیت کے اس عظیم و لافانی شاعر کے فکر و فن کے صحیح عرفان کے لیے سیدھی سادی زبان اور غیر فلسفیانہ انداز میں زیادہ سے زیادہ لکھا جائے تاکہ علامہ کے باب میں ہوجانے والی یا کردی جانے والی غلط فہمیوں کا رفتہ رفتہ ازالہ ہوجائے ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ حکیم مشرق ناقابل تقسیم ہے۔

ہاں تو گفتگو کا اصل موضوع "نیرنگِ ادب" ہے۔ ناظر صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ زمانے کی نیرنگیوں کا مقابلہ کرتے کرتے تھک کر چور ہوجانے کے بعد بھی اُن میں یہ جذبہ پیدا نہ ہوا کہ اب تک اِن ادبی خدمات کے صلے میں مجھے ملا ہی کیا ہے جو ان مضامین کو سینے سے لگائے رکھوں اور پھر اُنہیں چھپوانے کی بھی کوشش کروں۔ بلاشبہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ فن کار کی محنت کا صلہ خود اس کی اپنی تخلیق ہوتی ہے نہ کہ اس کا معاوضہ۔ وہ حسن حوصلے اور اعتماد کے ساتھ یہ دوسرا مجموعۂ مقالات منظر عام پر لا رہے ہیں وہ قابلِ قدر ہے۔

"اگر یہ توقع کی جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ادبی حلقوں میں "نیرنگ ادب" کی پذیرائی ضرور ہوگی کیوں کہ یہ بڑے کام کی چیز ہے خاص کر علم و ادب کے اُن متوالوں کے لیے جو اُردو کے کسی اعلیٰ امتحان کی تیاری کررہے ہوں۔"

ظفر الاسلام ظفر

تھانہ روڈ، بھیونڈی، ضلع تھانہ
۲۳، مارچ ۱۹۷۳ء

اس طرح ناظر انصاری صاحب خاندیش کے عظیم نقاد، صاحبِ طرز ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور مترجم ہیں جنھوں نے خاندیش کے نام کو برصغیر ہند و پاک کے علمی و ادبی حلقوں میں روشن کیا۔ انھوں نے زبان و ادب اور تعلیم کی گراں بہا خدمات انجام دی ہیں وہ کبھی خاموش نہیں کی جائینگی۔ وہ جتنے عظیم ادیب تھے

اتنے عظیم انسان بھی تھے ۔ مجھے یاد نہیں کہ انھوں کبھی کسی کا دل دکھایا ہو ۔ چھوٹوں سے بھی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے ۔ وہ مجسم اخـــلاق تھے ۔ سادگی کا پیکر تھے شیریں دہن تھے ۔ عاجزی و انکساری کا پتلا تھے ۔ نہایت شفیق استاد تھے ۔ اُن کا کردار اقبال کے اس شعر کی تفسیر تھاــــ

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

نہایت عسرت و غربت کی زندگی گزاری لیکن اپنی (خودی) کو نہ پہنچا ۔ زمانے کی ناقدری کی کبھی شکایت نہ کی تندیٔ بادِ مخالف سے کبھی نہیں گھبرائے ۔ اُن کے جیسا صابر و شاکر اور شریف النفس کسی کو نہ دیکھا ع

خدا تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

•

مہاراشٹر میں اُردو اسٹیج کی روایت

از

ڈاکٹر یونس اگاسکر
صدر شعبۂ اردو، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی

مہاراشٹر میں اُردو اسٹیج کی روایت کا جائزہ لینے سے پہلے اُردو اسٹیج کے آغاز پر ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔ مشہور محقق پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے واجد علی شاہ کو اُردو اسٹیج کا بانی اور اُردو کا اولین ڈرامانگار تسلیم کیا ہے۔ اُن کے خیال میں واجد علی شاہ کی تمثیل «رادھا کنہیا کا قصہ» اُردو کا پہلا ڈراما ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی تحقیق اور اس کے نتائج سے استفادے کے لیے اُن کی دو تصانیف «اُردو ڈراما اور اسٹیج» اور «لکھنؤ کا شاہی اسٹیج» کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ «رادھا کنہیا کا قصہ» اُن کی تصنیف «اُردو ڈراما اور اسٹیج» کے ضمیمے میں شامل ہے۔ پروفیسر رضوی کا خیال ہے کہ یہ ڈراما ۱۲۵۲ھ یعنی ۱۸۴۲ع یا ۱۸۴۳ع کی تصنیف ہے۔

رضوی صاحب کے علاوہ جن لوگوں نے اُردو ڈرامے پر تحقیقی کام کیا ہے اُن میں سے اکثر کا خیال ہے کہ «رادھا کنہیا کا قصہ» مکمل ڈراما نہیں تھا بلکہ ناچ گانوں پر مشتمل اوپیرا یا اُس سے ملتا جلتا تماشا تھا۔ ڈاکٹر عطیہ نشاط کے مصداق:

«کسی قصے کو ڈراما کہنے کے لیے جس عمل و حرکت، کشمکش اور تصادم کی ضرورت ہوتی ہے، اس کا یہاں نام بھی نہیں ہے . . . . کرداروں میں کوئی پیچیدگی، کوئی اُلجھن نہیں ہے۔ سیدھے سادے سے کردار ناچ گانوں کی لڑیوں میں گوندھے گئے ہیں . . . . اس کوشش کو ڈرامے کا پہلا قدم کہا جاسکتا ہے لیکن اس ابتدائی کوشش کو ڈراما نہیں کہا جاسکتا۔»[1]

واجد علی شاہ اُردو اسٹیج کے بانی اور اولین ڈرامانگار نہ سہی اُن کی کوششوں کی اولیت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اُن کے حکم اور ذاتی نگرانی کے تحت لکھنؤ کے قیصر باغ میں جو رہس اور اوپیرا کھیلے جاتے تھے ان کی

---

۱) اُردو ڈراما: روایت اور تجربہ، ص ۵۶-۵۷

شہرت نے لکھنؤ اور اطرافِ لکھنؤ میں اس قسم کے کھیل یا تمثیلیں پیش کرنے کا شوق پیدا کردیا چنانچہ شاہی رہس کی ترتیب و پیشکش کا حال سن کر امانت لکھنؤی نے ایک کھیل تیار کیا جس میں راجا اندر اور اس کی سبھا کی ایک پری کا قصہ گوندھا گیا تھا اور پری کی ایک آدم زاد سے محبت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کشمکش سے اُس میں ڈرامائی تاثر اُبھارا گیا تھا۔

پروفیسر احتشام حسین کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ «اس قصے میں میر حسن کی مثنوی ‹ سحر البیان › کا غیر معمولی اثر نظر آتا ہے ۔ » نہ صرف ‹ سحر البیان › بلکہ دیا شنکر نسیم کی مثنوی ‹ گلزارِ نسیم › سے بھی امانت نے استفادہ کیا ہے ۔ لیکن ان کی یہ خدمت یقیناً قابلِ ذکر ہے کہ اُردو میں ڈرامے کے فنی لوازم سب سے پہلے انھیں کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچے ۔ انھوں نے ایک ایسا منظوم قصہ ترتیب دیا جسے کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا جاسکتا تھا

پروفیسر مسعود حسن رضوی نے ‹ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج › میں امانت کی ‹ اندر سبھا › کا سال تصنیف ۱۸۵۲ ع بتایا ہے یعنی ‹ رادھا کنہیا کا قصہ › کے دس سال بعد ۔ ڈاکٹر عطیہ نشاط کا اندازہ ہے کہ جنوری ۱۸۵۳ ع میں پہلی بار ‹ اندر سبھا › کھیلی گئی اس میں رقص و موسیقی اور گانوں کی کثرت کے باوجود قصے کے تجسس اور ڈرامائی کیفیت نے اسے غیر معمولی مقبولیت عطا کی جگہ جگہ اس کے شو ہوئے اور گھر گھر اس کی دھوم مچ گئی چنانچہ امانت کی تقلید میں بیسیوں ‹ اندر سبھائیں › لکھی اور اسٹیج کی گئیں پروفیسر مسیح الزماں کی تحقیق کے مطابق بمبئی کی متعدد پارسی ناٹک منڈلیوں نے ‹ اندر سبھائیں › پیش کیں اور راجا اندر کے دربار کے انعقاد کے لیے مختلف مناظر سے مزین مصور پردوں کا اہتمام کیا گیا، نئے نئے ناچ اور گانے ترتیب دیے گئے یہاں تک کہ شہزادہ گلفام کو اڑا لانے کے لیے سبز پری کو اُڑن کھٹولا بھی مہیا کیا گیا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُنیسویں صدی میں بمبئی کا اسٹیج کتنا ترقی یافتہ تھا اور اودھ کے مقابلے میں مہاراشٹر میں اسٹیج کی روایت کتنی پختہ و دیرینہ تھی۔

مہاراشٹر میں مطلقاً اسٹیج کی تاریخ تو اردو اسٹیج سے خاصی پرانی ہے

لیکن صرف اردو اسٹیج اور ڈرامے کی روایت پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس سرزمین پر بھی اس کے اولین نقوش مل جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ واجد علی شاہ رہس یا (رادھا کنھیا کا قصہ) کو اگر اصولی طور پر ڈراما اور ان کی کوشش کو ڈراما نگاری نہ سمجھا جائے تو امانت کی (اندر سبھا) اور سانگلی کے ایک مراٹھا ڈراما نویس وشنو پنت بھاوے کے ترتیب دیے ہوئے ہندوستانی ناٹک (راجا گوپی چند جالندھر) میں اولیت کے تمغے کے لیے مقابلہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے وافر ثبوت مہیا ہوچکے ہیں کہ وشنو داس بھاوے نے اپنا یہ ڈراما ۱۸۵۲ء یا ۱۸۵۳ء میں بمبئی میں پیش کیا۔

وشنو داس بھاوے کو مراٹھی کا اولین ڈراما نگار اور مراٹھی اسٹیج کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ وہ سانگلی کے رہنے والے تھے اور انھوں نے اپنی ایک ناٹک کمپنی (ہندو ناٹک منڈلی) کے نام سے قایم کی تھی۔ اپنی ناٹک منڈلی کے ساتھ وہ جب دوسری مرتبہ بمبئی کے دورے پر آئے تو انھوں نے یہاں کی عام فہم زبان ہندوستانی میں ایک ناٹک تیار کرکے پیش کیا (راجا گوپی چند جالندھر)۔ مراٹھی کے مشہور محقق اور مراٹھی اسٹیج کے مستند مورخ سری۔ نا۔ بنہٹی نے اپنی کتاب (مراٹھی رنگ بھومی چا اِتہاس) میں بھاوے کے تذکرے میں اُن کے اس ہندوستانی ناٹک کا ذکر کیا ہے اور اسے ۵۳-۱۸۵۲ء کی تصنیف بتایا ہے۔ اُس دور کے اخبارات انگریزی میں اِس ڈرامے کے اشتہارات شائع ہوئے اور اس پر تبصرے بھی کیے گئے تھے۔

بھاوے کے اس ہندوستانی ناٹک کی نقل دوسری ناٹک منڈلیوں نے کی اور امانت کی (اندر سبھا) کی طرح (گوپی چند جالندھر) بھی متعدد کمپنیوں کے ذریعے بار بار اسٹیج کیا گیا۔ بھاوے کے ڈرامے کا مکمل اسکرپٹ تو دستیاب نہیں ہے لیکن دوسری کمپنیوں کے مسودات مل جاتے ہیں۔ البتہ بھاوے کی مرتبہ کتاب (ناٹیہ کویتا سنگرہ) میں (گوپی چند آکھیان) کے زیر عنوان اس ڈرامے کا منظوم حصہ شامل ہے یہ کتاب جنوری ۱۸۸۵ء میں پونا سے شائع ہوئی ہے۔

مہاراشٹر میں اُردو اسٹیج کی روایت زیادہ تر بمبئی کے اُردو اسٹیج کی تاریخ کے دامن سے وابستہ ہے اگرچہ مہاراشٹر کے مختلف علاقوں میں ماضی میں

بھی اردو اسٹیج کی روایت رہی ہے لیکن اس کی نقوش اتنے دھندلے پڑگئے ہیں کہ ان کی بازیافت آسان نہیں. اس کے مقابلے میں بمبئی کا اردو اسٹیج بڑی روشن تاریخ کا حامل ہے . خاص طور سے پارسی ناٹک منڈلیوں کی اُردو خـــدمات تو سورج کی طرح روشن ہیں

پارسی ناٹک کمپنیوں کے دستیاب شدہ اُردو ڈرامـــوں میں سب سے قدیم «خورشید» ہے . اسے ایدل جی جمشید جی کھوری نے گجـــراتی میں لکھا تھا اور مشہور پارسی ڈراما نگار ادی مرزبان کے والد بہـــرام جی فریدون جی مرزبان نے اُردو میں منتقل کیا تھا. «خورشید» ۱۸۷۱ع میں پہلی بار اسٹیج کیا گیا.

اس ڈرامے میں پچیس سین ہیں. پلاٹ ڈھیلا ڈھالا اور بے تکا ہے لیکن ڈرامائی کشمکش موجود ہے «اندر سبھا» کے برخلاف «خورشید» نثری ڈراما ہے اس میں منظوم مکالمے نہیں ہیں. اسے وکٹوریا ناٹک منڈلی نے پیش کیا تھا. اس کمپنی نے «نورجہاں» اور «حاتم» کے نام سے مزید دو اُردو ڈرامے بھی اسٹیج کیے. وکٹوریا ناٹک منڈلی کی کامیابی کو دیکھ کر دوسری ناٹک منڈلیوں نے بھی اُردو ڈراموں کی طرف توجہ کی دادا بھائی ٹھونٹھی نے ہندی ناٹک منڈلی کے نام سے ایک نئی کمپنی قایم کی اور کافی پیسا خرچ کرکے «بے نظیر بدرِ منیر» اسٹیج کیا. اس میں پری کے ذریعے شہزادہ بے نظیر کو پلنگ سمیت اُڑا لے جانے کا سین بھی دکھایا گیا تھا جو اُس وقت ایک عجوبے سے کم نہیں تھا اس ڈرامے میں مناظر کے پردوں اور سجاوٹ کے علاوہ اداکاری اور مکالموں پر بھی خاص دھیان دیا گیا تھا لیکن ناچ گانوں کی کمی کے سبب اسے کامیابی نصیب نہ ہوسکی.

پارسی ناٹک کمپنی کے ذریعے اُردو ڈراموں کی پیشکش کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا. شروع میں پارسیوں نے خود ہی ڈرامے لکھے جن کی زبان فصیح اور بامحاورہ نہیں تھی مگر آہستہ آہستہ انھیں اہلِ زبان ڈراما نگاروں کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور ان کمپنیوں نے ہندو مسلمان اہل قلم کو بطور ملازم رکھ کر ان سے ڈرامے لکھوانے شروع کیے چنانچہ عرب ایرانی قصوں، ہندو دیومالائی حکایات اور سنسکرت و انگریزی کے ڈراموں کی بنیاد پر سیکڑوں ڈرامے لکھے

اور اسٹیج کیے گئے منشی ونایک پرشاد طالب بنارسی، منشی سید مہدی حسن احسن لکھنوی، منشی شیخ محمود رونق بنارسی، میر غلام عباس، منشی محمد علی مراد لکھنوی، پنڈت نارائن پرساد بیتاب دہلوی اور سب سے بڑھ کر آغا حشر کاشمیری نے نہ صرف عرب و ایران اور ہندو دیومالا سے حکایتیں لیں اور سنسکرت و انگریزی سے آزاد تراجم کیے بلکہ طبع زاد ڈرامے بھی لکھے جن کی دھوم سارے ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بھی مچتی رہی۔ خاص طور سے طالب احسن، رونق، بیتاب اور آغا حشر کے ڈراموں نے تو اُردو اسٹیج کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔

آغا حشر کے زمانے تک بمبئی کا اُردو اسٹیج جو ہندوستان بھر کے دوروں کے سبب مہاراشٹر ہی کیا برصغیر کا اردو اسٹیج کہلایا جاسکتا ہے، دیو پریوں کی حکایتوں اور دیومالائی قصوں سے نکل کر عصری زندگی کی عکاسی کرنے لگا تھا۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی فطری انداز پر مائل اور مسجع و مقفّی مکالموں سے منحرف ہوتا جارہا تھا۔ محض پردے لگا کر منظر پیش کرنے کی جگہ سیٹ اُبھارنے میں بہت ترقی کرگیا تھا یہاں تک کہ منظر کی تبدیلی گھومنے والے اسٹیج کے ذریعے منٹوں میں کی جانے لگی تھی۔

پارسی اسٹیج کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس نے ناٹکوں میں مزاح کو پوری طرح استعمال کیا۔ اکثر ڈراموں کے ساتھ لوگوں کی تفریح طبع کے لیے مزاحیہ فارس رکھے جاتے تھے جن سے اس صنفِ ادب کو بڑا فایدہ پہنچا دوسری بڑی اور زیادہ اہم خدمت یہ ہوئی کہ ان کے ذریعے سماجی اصلاح کی کوششیں بھی کی گئیں۔ سماجی برائیوں پر تنقید کرکے ان ڈراموں اور فارسوں نے تماش بینوں کو اپنی اصلاح پر آمادہ کیا۔

فلم انڈسٹری کے آغاز اور خاص طور سے بولتی فلموں کے چلن نے اُردو اسٹیج کو زوال پذیر کردیا اور کاروباری اعتبار سے یہ پچھڑ گیا۔ آہستہ آہستہ اردو اسٹیج کا تقریباً خاتمہ ہوگیا، مگر آزادی کے بعد پرتھوی راج کپور کے پرتھوی تھیٹر اور انڈین پیپلز تھیٹر اسوسی ایشن یعنی اپٹا نے سماجی و سیاسی مسائل

پر ڈرامے کر کے اور مہاراشٹر و مہاراشٹر کے باہر دورے کر کے اس کے ناتواں جسم میں نیا خون بھرنے کا کام جاری رکھا۔

اپٹا نے ڈراموں کے توسط سے اُردو اسٹیج کو عوام سے قریب تر لانے میں خصوصی رول ادا کیا ہے۔ اگرچہ اس کے ابتدائی ڈراموں میں اشتراکی تصورات اور انقلابی خیالات کا پرچار ہوتا رہا مگر آہستہ آہستہ اس نے متوازن راہ اختیار کی اور سماجی انصاف اور دیش بھکتی کے تصورات پر مبنی ڈراموں کے ذریعے اسٹیج کی خدمت کا اہم فریضہ انجام دیا

پرتھوی تھیٹر نے حب الوطنی اور قومی ایکتا کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لیے اردو اسٹیج کو وسیلہ بنایا۔ تقسیم وطن پر اس کا مشہور ڈراما ’دیوار‘ اور قومی یک جہتی پر ’پٹھان‘ اعلیٰ درجے کی تمثیلیں ہیں۔ اپٹا نے محنت کش عوام اور دیہی سماج تک اسٹیج کو لے جانے کی نمایاں کوشش کی تو پرتھوی تھیٹر نے شہروں کے متوسط اور اعلیٰ متوسط طبقوں کو اردو اسٹیج کی طرف نئے سرے سے متوجہ کیا

ان دو اہم تنظیموں کے علاوہ نئے ہندوستان میں گذشتہ ربع صدی میں متعدد گروپ وجود میں آئے اور ان میں سے کچھ اب بھی فعال ہیں۔ جیسے تھیٹر یونٹ، مجمع، جوہو آرٹ تھیٹر، کلاکار سنگم، ایک جوٹ، انک، ایکٹ وغیرہ۔ اسی طرح ڈرامے کے شوقین نوجوانوں میں شفیع انعام دار، اسلم پرویز اور مجیب خان نے اردو ڈرامے لکھ کر، ڈائریکٹ کر کے اور ان کے شو منعقد کر کے اردو اسٹیج کی خدمت کی ہے اور کر رہے ہیں

گذشتہ کئی سال سے مہاراشٹر اردو اکادمی نے مہاراشٹر بھر کے تھیٹر گروپوں کو مالی امداد دینے اور مہاراشٹر کے مختلف علاقوں میں ڈراموں کے مقابلے منعقد کر کے ان کی ہمت افزائی کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے نتیجے میں بمبئی سے باہر بھی اردو اسٹیج جڑیں پکڑ رہا ہے۔ اگر ہمارے ناظرین کی تعداد میں اضافہ ہو تو اردو اسٹیج کو سہارا مل سکے گا کاش کہ ہمارا تماشائی اس میڈیم کی اہمیت کو سمجھتا۔

●

کتابی دنیا

اردو الفابیت انتو دیوناگری لیپی

URDU ALPHABET INTO DEVANAGARI LIPI

(مصنفہ ڈاکٹر این ایس گوریکر)

تبصرہ از : ڈاکٹر حامداللہ ندوی

•

کتاب انگریزی میں ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں اردو حروف کی آوازوں کی صحیح ترجمانی کے لئے ہندی رسم الخط میں ترمیم و اضافہ کے بعض بنیادی اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔

کتاب کا اصل حصہ تین مقالوں پر مشتمل ہے، (۱) Urdu Alphabet into Devanagari Lipi (اردو حروف دیوناگری لپی میں)، (۲) Urdu Research Institute (اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) اور (۳) Author of the Book (مصنف کتاب)

پہلے مقالے میں زبان کے آغاز اور اس کی مختلف تحریری صورتوں کی تاریخ ہے اور پھر اردو رسم خط کا پس منظر بیان کرنے کے بعد بتایا ہے کہ وقتاً فوقتاً اس کو رومن اور بعض دوسرے حروف میں لکھنے کی جو کوششیں ہوئیں اُن کے محرکات کیا تھے اور آج اردو کو دیوناگری حروف میں لکھنے کا جو رجحان عام ہو رہا اس کو مفید اور موثر بنانے کے لئے کیا طریقے استعمال کئے جاسکتے ہیں پھر انھوں نے اردو حروف کو دیوناگری حروف میں بدلنے کے لئے ایک اسکیم پیش کی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ "مہاراشٹرا اسٹیٹ بورڈ آف لٹریچر اینڈ کلچر" کی منظوری سے مصنف نے اس اسکیم کو "اردو مراٹھی شبد کوش" کی ترتیب میں نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

دوسرے مقالہ میں انجمن اسلام کے مشہور تحقیقی ادارہ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی تاریخ، اس کے اغراض و مقاصد اور اس کی پچاس سالہ کارکردگی کی تفصیلات ہیں

تیسرے مقالہ میں خود صاحب کتاب کے حالات زندگی اور اُن کی علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات کا تذکرہ ہے۔

کتاب کا آغاز (دیباچہ) Preface، (پیش لفظ) Foreword اور (تعارف) Introduction سے ہوا ہے۔

دیباچہ میں فاضل مصنف نے ترجمانی (Transliteration) کے سلسلہ میں مستشرقین کی کوششوں کا مختصراً ذکر کرنے کے بعد بتایا ہے کہ "ان کے دل میں اردو حروف کو دیوناگری لپی میں بدلنے کا خیال اس وقت آیا جب مہاراشٹرا اسٹیٹ بورڈ آف لٹریچر اینڈ کلچر عمق نے سنہ ۱۹۶۸ع میں (اُردو مراٹھی شبد کوش) کی ترتیب کے سلسلہ میں انہیں مدیر تنقیح (Scrutiny Editor) مقرر کیا "

پیش لفظ میں صدر انجمن اسلام ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا نے فاضل مصنف کی اس کوشش کو سراہا ہے اور لکھا ہے کہ "پروفیسر گوریکر نے اس اسکیم کی تیاری میں کافی محنت کی ہے جس کا اعتراف اردو، ہندی اور خاص طور پر مراٹھی کے اسکالرز نے بھی کیا ہے "

تعارف میں پروفیسر نسیم عرکیل نے اس اسکیم کے ساتھ ساتھ فاضل مصنف کی بھی بے حد تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ "پی. ای. این. آل انڈیا سینٹر ایکزکیوٹیو کمیٹی (P. E. N. All India Centre Executive Committe) کے ممبر ہونے کی وجہ سے مجھے تقریباً پچیس سال سے پروفیسر این ایس. گوریکر کی شناسائی کا شرف حاصل ہے۔ کمیٹی کی میٹنگوں میں میں نے انہیں ہمیشہ مدد و معاون اور دوستدار پایا اور اس کے مقاصد کی تکمیل میں وہ کافی سرگرم رہے۔ اردو فارسی اور اسلامی علوم کے لئے تو انھوں نے گویا اپنے آپ کو وقف کردیا ہے، وہ ایک عالمانہ منصوبے سے دوسرے عالمانہ منصوبے کی طرف مستقل طور پر بڑھتے رہتے ہیں اور اپنی مختلف حیثیتوں میں چاہے وہ ایک ادیب کی حیثیت ہو یا ایک ایڈیٹر کی، ہر اس شخص کے دل پر اپنا گہرا اثر چھوڑتے ہیں جو ان کے ذہنی رجحانات سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔"

"پروفیسر گوریکر انسانی تعلقات میں ایک سیدھے سادے، تصنع اور تکلف سے پاک، بے انتہا مثالی کردار کے حامل ہیں۔ ان کا مرکز توجہ ہمیشہ شخصیتوں سے زیادہ اُن کے اقـــدار کی طرف ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ انسانیت کی آفاقی قدروں میں ایمان رکھتے ہیں۔"

"ہر وہ شخص جو انھیں جانتا ہے، چاہے وہ معمولی طور پر ہی کیوں نہ ہو، ان کے طرز استدلال، ان کے کارناموں، ان کی بے تعصبی اور پسندیدہ احباب سے اُن کے لگاؤ کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے اپنے مخصوص مذہبی، اخلاقی اور روحانی معتقدات انھیں کسی ایسے فرد سے دور نہیں کرتے جو کسی اور عقیدے سے تعلق رکھتا ہو"

اردو ہندی، ہندوستان کی دو اہم زبانیں ہیں۔ اِن دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً کافی کوششیں ہوتی ہیں جـــو آج بھی جاری ہیں، گوریکر صاحب کی کتاب: ‹ Urdu Alphabet into Devanagari Lipi › بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے، اور چونکہ اس کتاب میں پیش کی ہوئی اسکیم کو عملاً استعمال بھی کیا جاچکا ہے اس لئے اِس اسکیم کی اہمیت نسبتاً بڑھ جاتی ہے۔

امید ہے کہ جو لوگ اردو ہندی کو زیادہ قریب لانے کی کوششوں میں مصروف ہیں وہ اس اسکیم سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گے۔

کشمیر کے فارسی ادب کی تاریخ

(مصنفہ جناب محمد منور مسعودی)

تبصرہ از

ڈاکٹر طاہرہ بنارسی

صاحب کتاب محمد منور مسعودی کو اردو زبان و ادب کے مطالعے پر مکمل عبور حاصل ہے۔ ‹ کشمیر کے فارسی ادب کی تاریخ › ان کی کتاب تاریخ کے علاوہ دینِ اسلام اور تصوف سے بھی ان کے لگاؤ کو ظاہر کرتی ہے۔

صحیح ہے کہ محمد منور مسعودی کی اس جدید تحقیق کا اپنا ایک منفرد مقام ہے اس کتاب میں مصنف نے افغان دور کی شاعری اور ان شعرا کی سوانح بڑی خوش اسلوبی سے بیان کئے ہیں اور اس میں فارسی شاعری، افغان دور کے نثری ادب، تاریخوں، تذکروں اور دیگر نثری تحریروں کا تاریخی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔

اس کتاب کو تین عہدوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

پہلا شہمیری عہد، دوسرا سلاطین چک کا عہد اور تیسرا منگولوں کا عہد ہے۔

کتاب، مصنف کے پُر زور تخیل، گہرے مشاہدہ اور وسیع مطالعہ کی غماز ہے۔ ممکن ہے یہ چیزیں دوسروں کے حصے میں بھی آئی ہوں مگر قلم کی بیباکی اور رعنائی نے "کشمیر کے فارسی ادب کی تاریخ" کو جس خوبی سے بیان کیا ہے وہ دوسری تاریخوں میں بہت کم دکھائی دیتی ہے۔

اس کتاب میں مندرجہ ذیل ابواب ہیں:

ماقبل فارسی ادب - بازگشت - شہمیری دور - چک دور - مغل دور - کے بعد انجمن شعرای فارسی کا قیام اور شاہنامۂ کشمیر اور
افغان دور میں فارسی شاعری - شائق سے پنڈت آفتاب بھان تک
افغان دور میں فارسی نثر - شیخ محمد عثمان سے لیکر ملا حیدر پشتو۔

مغلوں کے تسلط کے بعد فارسی بتدریج سارے مشرق کی علمی، ادبی اور سیاسی زبان بن گئی اور فارسی زبان کو اس مقام پر پہنچانے میں کشمیر کا ناقابلِ فراموش حصہ رہا ہے

افغان دور میں مجلس شعرائے کشمیر کا قیام اور شاہنامۂ کشمیر کی تدوین و تنظیم ایک بہت بڑا ادبی اور تاریخی کارنامہ ہے۔ کشمیر کے قابلِ ذکر ادیبوں، عالموں اور مورخوں میں علامہ تفضل حسین اور خواجہ عبد الکریم خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

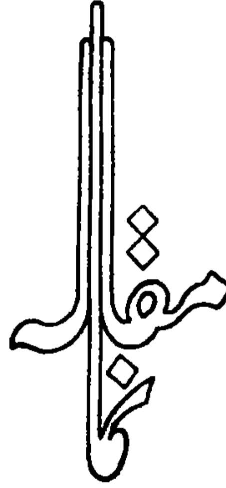
فارسی زبان و ادب کی بنیادیں کشمیر میں اس قدر مضبوط، استوار اور گہری ہوچکی تھیں کہ افغانوں کے تسلط سے یہ بنیادیں ہل نہ سکیں اس زبان و ادب کا ذوق و شوق رکھنے والوں نے اسکی ترویج و ترقی کے کام کو جاری رکھا جس کی وجہ سے فارسی زبان و ادب ترقی کرتے رہے اور عوامی زندگی کے دوسرے شعبوں کے برعکس اس میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی اس کتاب کے پڑھنے سے کشمیر کے شاندار ماضی کی داستان، شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات و تحریرات کی تصویر کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ حالانکہ یہ دور افراتفری اور انتشار کا دور تھا

منور مسعودی کی کتاب (کشمیر کے فارسی ادب کی تاریخ) کو پڑھنے سے تحقیق کی نئی راہیں اور نئے وسائل کھل کر سامنے آتے ہیں۔ کتابت و طباعت اور گیٹ اپ دیدہ زیب ہے اور حنان پبلیشرز، نسیم باغ سری نگر سے یہ کتاب دستیاب ہوسکتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ اُن کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی مقبول ہوگی اور انہیں ان کی کاوش کا صلہ ملیگا۔



Edited by Prof. Nizamuddin S Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director
Anjuman-i-Islam's Urdu Research Institute, Bombay-400 001
Published by Mr. Abdul Majeed Patka, B. Com (Hons)
General Secretary
Anjuman-i-Islam, Bombay-400 001 &
Printed by him from Adabi Printing Press
Saboo Siddik Polytechnic, 8, Shepherd Road, Bombay-400 008





اسلامیات

این میری شمل، مہر افشاں فاروقی (مترجم)

اسلامی تہذیب، شعر و ادب اور آج کی دنیا

(شب خون الہ آباد جولائی ۱۹۹۷ع، جلد ۳۱، شمارہ ۲۰۸)

این میری شمل، ایک مشہور جرمن اسکالر ہیں اسلام اور مسلم دنیا کے حالات ان کا موضوع ہے۔ ان کا یہ مضمون بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

شرجیل احمد خاں

علم و فن کے اسلامی سرچشمے

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ، جولائی ۹۷ع، جلد ۱۶، شمارہ ۷، ص ۴۰-۴۳)

خوش نویسی، سوانح نگاری، لغت نویسی، لسانیات اور ان سائنسی علوم کا ذکر جن کو اسلام نے فروغ دیا۔

علیم اشرف جائسی

ختم نبوت کے بعد کے مدعیان نبوت

(معارف اعظم گڈھ، اگست ۱۹۹۷ع، جلد ۱۶، شمارہ ۸، ص ۱۱۸-۱۴۰)

مسیلمہ، طلیحہ، بابیت، بہائیت، قادیانیت، باطنیت کی تفصیلی تاریخ اور ان کے عقائد و افکار کا تجزیہ۔

فاروقی، نثار احمد

علامہ سید سلیمان ندوی کی خدمات قرآن

(معارف اعظم گڈھ، اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۱۵۹، شمارہ ۴، ص ۲۹۳-۲۹۸)

سید سلیمان ندوی کی قرآنی خدمات کا ذکر اور اُن کے مضامین کی وضاحت جو انہوں نے قرآنیات پر لکھے ہیں۔

قاسمی عتیق احمد

امام غزالی، حیات و خدمات

(الفرقان لکھنؤ، ستمبر ۱۹۹۷ع، جلد ۶۵، شمارہ ۹، ص ۳۹۔۴۸)

امام غزالی کے حالات زندگی اور اُن کی دینی خدمات کا تذکرہ۔

مقصود احمد

بڑودہ میں موجود ایک قرآنی مخطوطہ

(برہان دہلی، مئی جون ۱۹۹۷ع، جلد ۱۲، شمارہ ۵۔۶، ص ۳۸۔۳۹)

خانقاہ رفاعیـــہ میں سید کمال الدین رفاعی کے زیر تحویل موجود ایک قرآنی مخطوطہ کا تعارف۔

ندوی رضوان علی

نور محمدی اور حدیث جابر

(معارف اعظم گڈھ، جولائی ۱۹۹۷ع، جلد ۱۶، شمارہ ۱، ص ۱۸۔۳۶)

حدیث جابر کا ایک جملہ ہے کہ "اللہ نے جو چیز سب سے پہلے پیدا کی وہ میرا نور تھا"، اس کا سہارا لے کر اکثر لوگوں نے یہ لکھ دیا ہے کہ خدا نے سب سے پہلے نور محمدی کی تخلیق کی، اس کے بعد ساری کائنات کو، مضمون میں اس کی تردید ہے۔

ندوی مختار احمد

کیا مسلمان خواتین کا مسجد میں آنا فتنہ ہے

(البلاغ بمبئی، مارچ ۱۹۹۷ع، جلد ۷، شمارہ ۸، ص ۱۹۔۲۴)

احادیث کی روشنی میں بتایا ہے کہ مسجدوں میں عورتوں کی حاضری اُن کا دینی حق ہے۔

ادبیات

آدم شیخ

ایوان ملا رموزی کے پس منظر میں

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم اور ۸ اگست ۱۹۹۷ع، جلد ۵۶، شمارہ ۲۹، ۳۰، ص ۸ اور ۳)

ایوان ملا رموزی بھوپال میں اردو کے مایوس کن مستقبل پر ایک بحث، جس میں عبدالقوی دسنوی اور مسعود صدیقی

دو فریق تھے، اس بحث پر مقالہ نگار کے اپنے خیالات و تاثرات۔

احمد سہیل

نئی روایت کا شاعر

(شاعر بمبئی، جلد ٦۸، شمارہ ۳، ص ۲٦-۲۴)

(Ernesto Cardinal) ارنسٹو کارڈینل کا تعارف نئی روایت کے شاعر کی حیثیت سے، وہ ہسپانوی زبان کے سب بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ نکاراگوا کے باشندے تھے جو لاطینی امریکہ کا حصہ ہے

اشفاق احمد اعظمی

فسانۂ عجائب کا جائزہ، بنیادی متن کی روشنی میں

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم جون ۱۹۹۷ع، جلد ۵٦، شمارہ ۲۱، ص ۲ اور ۷)

فسانۂ عجائب کے بنیادی متن کا تعارف اور سرور کے نثر کی امتیازی خصوصیات کا ذکر۔

اصلاحی ضیاءالدین

مولانا حکیم سید عبدالحی کی ادبی نکتہ سنجی و سخن فہمی گل رعنا کی روشنی میں

(معارف اعظم گڈھ، اپریل-مئی ۱۹۹۷ع جلد ۱۵۹، شمارہ ۴ اور ۵، ص ۲۴۵-۲٦۹، ۳۲۵-۳۵۴)

تذکرہ گل رعنا کی ادبی و فنی خوبیوں کی تفصیل۔

اقبال مسعود

شعری بھوپالی، دبستانِ بھوپال کا مہکتا گلاب

(کتاب نما نئی دہلی، اگست ۱۹۹۷ع، جلد ۳۷، شمارہ ۸، ص ۷۱-۷۵)

محمد اصغر شعری بھوپالی کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کا جائزہ

امجد حسن سعید احمد

مصر میں اردو (۱۹۸۰ع سے ۱۹۹٦ع تک)

(اخبار اردو، اسلام آباد، اپریل ۹۷ع، جلد ۱۴، شمارہ ۴، ص ۱۱-۱۳)

جامعہ ازہر، قاہرہ یونیورسٹی، عین شمس یونیورسٹی، اسکندریہ یونیورسٹی میں اردو داخل نصاب ہے، تفصیلات درج ہیں۔

انصاری نثار احمد

ابتدائی دور کا گوجری ادب

(معارف اعظم گڈھ، جولائی ۱۹۹۷ع، جلد ۱۶۰، شمارہ ۱، ص ۴۶-۶۶)

گوجری زبان اور اس کے ابتدائی ادب کی تفصیلات۔

انور سدید

۱۹۹۶ع کی غزل

(شاعر بمبئی، جلد ۶۸، شمارہ ۳، ص ۵-۸)

سن ۱۹۹۶ع کی شائع شدہ جدید غزلوں کا جائزہ۔

بدیع الزماں

اقبال کی نظم «خضر راہ» کا تجزیاتی مطالعہ

(نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۴۷، شمارہ ۱، ص ۱-۲۴)

بانگ درا کی نظم «خضر راہ» کی عملی ادبی شرح۔

علامہ اقبال اور علی بخش

(آموزگار جلگاؤں، مارچ ۱۹۹۷ع، جلد ۷۶، شمارہ ۳، ص ۱۴-۱۷)

اقبال کے ایک وفادار ملازم علی بخش کی خدمات کا ذکر۔

بلگرامی سید مرتضی حسین

حدسی صاحب کا شہر آشوب

(کتاب نما نئی دہلی، اگست ۱۹۹۷ع، جلد ۳۷، شمارہ ۸، ص ۶۳-۷۱)

حدسی کے حالات زندگی اور ان کی ایک نظم کا تعارف، متن کے ساتھ۔

جابر حسین

نتھونی لال وحشی

(آجکل نئی دہلی، ستمبر ۱۹۹۷ع، جلد ۵۶، شمارہ ۲، ص ۱۵-۱۶)

وحشی کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کا تعارف۔

جین گیان چند

حکیم پدم سین اور ان کا قدیم معدوم سفر نامہ

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ اپریل ۹۷ع، جلد ۵۶، شمارہ ۶، ص ۱)

حکیم پدم سین کے حالات زندگی، اور ان کے سفرنامۂ ایران کا خلاصہ جو اب

معدوم ہے۔

حبیب نثار

قطب شاہی عہد میں دکنی ادب اور موسیقی

(سب رس حیدر آباد، اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۵۹، شمارہ ۲، ص ۲۰-۲۸)

قطب شاہی دور کے ادب اور موسیقی کا ایک جائزہ۔

حسین ایم۔ رڈ

امام بخش صہبائی اور اردو زبان و ادب

(نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۴۷، شمارہ ۱، ص ۹۳-۱۰۱)

امام بخش صہبائی کی ادبی و لسانی خدمات کا جائزہ۔

خورشید نعمانی

اردو ادب میں شری رام چندر جی کا ذکر

(ہندوستانی زبان بمبئی، جولائی - ستمبر ۹۷ع، سال ۲، شمارہ ۳، ص ۱۴-۱۷)

رام چندر جی کے حالات زندگی اور اُن اردو شعراء کا ذکر جنھوں نے اپنی شاعری میں رام چندر جی، ان کی شہرت اور ان کے فلسفۂ زندگی سے متاثر تھے۔

دسنوی عبدالقوی

سر راس مسعود اور مادری زبان کی اہمیت

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۵۶، شمارہ ۱۵، ص ۸)

سراج میر خان سحر کے مجموعہ میں درج مادری زبان کی اہمیت پر سر راس مسعود کے ریمارکس۔

کچھ آنند نرائن ملا صاحب کے بارے میں

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم اگست ۹۷ع، جلد ۵۶، شمارہ ۲۹، ص ۱)

ملا صاحب کی بھوپال میں آمد کا ذکر اور سیفیہ کالج میں ان کی تقریر کا ذکر۔

دلوی، عبدالستار

امیر خسرو کی عوامی شاعری اور سیاسی اخلاقیات

(ہندوستانی زبان بمبئی، جولائی - ستمبر ۹۷ع، سال ۲، شمارہ ۳، ص ۴-۱۳)

امیر خسرو کے حالات زندگی اور اُن کی عوامی و اخلاقی شاعری کا جائزہ۔

رام پرکاش راہی

مرشد ادبیات ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ جون ۱۹۹۷ع،
جلد ۵۶، شمارہ ۲۳، ص ۸)

تارا چرن رستوگی کے حالات زندگی اور ان کی انگریزی اردو تصانیف کا ذکر۔

ساز عبد الاحد

اردو شاعری اور انسانیت کا سفر

(ہندوستانی زبان بمبئی، اپریل۔جون ۹۷ع،
سال ۲، شمارہ ۲، ص ۱۱۔۲۰)

شاعری اور انسانیت میں جو آفاقی رشتہ ہے۔ اس کی روشنی میں اردو شاعری کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔

سعید النساء بیگم

اپیندر ناتھ اشک۔ اردو اور ہندی
دونوں زبانوں کا ممتاز ادیب

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ جون ۱۹۹۷ع،
جلد ۵۶، شمارہ ۲۴، ص ۳، ۶)

اشک کے حالات زندگی، ان کی شخصیت اور کارناموں کا تذکرہ

سلام بن رزاق

ماحول کا زہر اور افسانہ نگار
کی ذمہ داری

(ہندوستانی زبان بمبئی، اپریل۔جون ۹۷ع،
سال ۲، شمارہ ۲، ص ۲۱۔۲۵)

انسانیت کی طویل تاریخ کی روشنی میں افسانہ اور افسانہ نگار کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی ہے۔

شاہد رواقمہ علی

«کلید جنت» لاہور کا نعتیہ گلدستہ

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ مئی ۱۹۹۷ع،
جلد ۵۶، شمارہ ۲۰، ص ۱۔۲)

اردو گلدستوں کی تاریخ اور «کلید جنت» کا تعارف جس میں لاہور کے دو نعتیہ مشاعروں کا ذکر ہے۔

صدیقی آفاق حسین

عاشق اردو۔ صادق حسین صدیقی

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ اپریل ۱۹۹۷ع،
جلد ۵۶، شمارہ ۱۸، ص ۲)

بھوپال کے مشہور ادیب صادق حسین صدیقی کے حالات زندگی۔

صدیقی کمال احمد

عروض معروض

(کتاب نما نئی دہلی۔ اگست ۱۹۹۷ع، جلد

۳۷، شمارہ ۸، ص ۳۵-۴۵)

حکیم اوم پرکاش اگروال زارکی ایک رباعی پر عروضی نقطۂ نظر سے ایک بحث۔

ظفر کمالی

احمد جمال پاشا، علی گڈھ کے
ممتاز مزاح نگار

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ، اگست ۹۷ ع، جلد ۱٦، شمارہ ۹، ص ۲۴-۳۳)

احمد جمال پاشا کے حالات زندگی اور اُن کی مزاح نگاری کا جائزہ

عبدالمغنی

پنڈت آنند نرائن ملا کی
شخصیت اور شاعری

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ جولائی ۹۷ ع، جلد ۵٦، شمارہ ۲۸، ص ۱ اور ٦)

آنند نرائن ملا کی شخصیت اور شاعری کا ذکر، ایک تصویر کے ساتھ جس میں مرار جی بھائی دیسائی کو اردو گھر کے افتتاح کے سلسلہ میں دکھایا گیا ہے، یکم نومبر ۱۹۷۷ع جب وہ وزیر اعظم تھے۔

عثمانی، ابو الفیض

راجستھان میں اردو زبان و ادب کا
آغاز و ارتقا

(نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۴۷ شمارہ ۱، ص ۳۷-۴۷)

راجستھان میں اردو زبان و ادب کی تاریخ

فاروقی شمس الرحمٰن

ہماری کلاسیکی غزل کی شعریات،
کچھ تنقیدی کچھ تاریخی باتیں

(شب خون الہ آباد، جولائی ۱۹۹۷ع، جلد ۳۱، شمارہ ۲۰۸، ص ۹-۲۰)

کلاسیکی اردو غزل کی شعریات سے بحث، اس کے تصورات کی روشنی میں۔

فاطمی علی احمد

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(ہندوستانی زبان ممبئی، اپریل-جون ۹۷ ع، سال ۲، شمارہ ۲، ص ۴-۱۰)

تقسیم ہند سے پہلے اور بعد کے اردو افسانوں کا ادبی، سماجی اور فنی جائزہ۔

قریشی، نسیم الدین

شاہ میراں جی خدا نما

(سب رس حیدر آباد، اپریل ۱۹۹۷ع،

جلد ۵۹، شمارہ ۳، ص ۲۹-۳۵)

میراں جی خدا نما کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کا جائزہ۔

قاضی سید محمد حسین

حضرت بیدار دہلوی

(برہان دہلی، مئی-جون ۱۹۹۷ع، جلد ۱۲، شمارہ ۵-۶، ص ۲۶-۲۷)

بیدار دہلوی کے حالات زندگی اور ان کی شعر و شاعری کا تذکرہ۔

قیوم خضر

غالب کا سومنات خیال - ایک مبصرانہ راویۂ نظر

(کتاب نما نئی دہلی، اگست ۱۹۹۷ع، جلد ۳۷، شمارہ ۸، ص ۲۱-۲۵)

«غالب کا سومنات خیال» علی سردار جعفری کا ایک مقالہ ہے جس میں غالب کی مثنوی «چراغ دیر» کا اردو ترجمہ و تبصرہ ہے۔ مقالہ نگار نے اس پر اظہار خیال کیا ہے۔

قیوم صادق

عادل شاہی دور کا ادب

(نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۴۷، شمارہ ۱، ص ۷۵-۹۱)

بیجاپور دکن کے عادل شاہی دور کی ادبی و لسانی تاریخ۔

کرشن موہن

شجاع خاور کی غزلیں

(کتاب نما نئی دہلی، اگست ۱۹۹۷ع، جلد ۳۷، شمارہ ۸، ص ۶۰-۶۲)

شجاع خاور کی غزلوں کا تجزیہ فنی، ادبی اور معنوی نقطۂ نظر سے۔

کور سین

تونسہ سے طنز تک

(آجکل نئی دہلی، ستمبر ۱۹۹۷ع، جلد ۵۶، شمارہ ۲، ص ۱۲-۱۴)

فکر تونسوی کے شخصی حالات اور ان کے طنزیہ شعری و نثری ادب کا جائزہ۔

محب عارفی

غزل - ایک فطری صنف سخن

(کتاب نما نئی دہلی، اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۳۵، شمارہ ۴، ص ۹-۱۸)

غـــزل کا تعارف، ایک فطری صنف سخن کی حیثیت سے۔

محمد انور الدین

وحدی کرنولی ۔ حیات اور کارنامے

(ہندوستانی زبان بمبئی، جولائی ۔ ستمبر ۱۹۹۷ع، سال ۲، شمارہ ۳، ص ۱۰۔۱۳)

وحدی کے حالات زندگی اور اس کی دکنی تصانیف کا تذکرہ۔

محمد ایوب واقف

اقبال اور کلام اقبال میری نظر میں

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم مئی ۱۹۹۷ع، جلد ۵٦، شمارہ ۱۷، ص ۱۔۲)

اقبال اور کلام اقبال کے متعلـــق مضمون نگار کے تاثرات

مہاراشٹر میں اردو کی صورت حال

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ جولائی ۹۷ع، جلد ۵٦، شمارہ ۲۷، ص ۱۔۲)

مہاراشٹر میں ضلع پریشد اور میونسپل کارپوریشن کے تحت چلنے والے پرائمری، سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری اسکولوں کی تفصیل جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔

محمد نعمان

مہاکوی کالی داس اور اردو ادب

(کتاب نما نئی دہلی، ستمبر ۱۹۹۷ع، جلد ۳۷ شمارہ ۹، ص ۷۳۔۸۴)

اجین کے مشہور زمانہ سنسکرت کوی کالی داس کے حالات زنـــدگی، ان کے ڈراموں اور شعری مجموعوں کا ذکر اور ان کے اردو تراجم کا جائزہ۔

شرار عشق ۔ اردو کی مختصر ترین داستان

(آجکل نئی دہلی، ستمبر ۱۹۹۷ع، جلد ۵٦، شمارہ ۲، ص ۲۹۔۳۰)

رجب علی بیگ سرور کی مختصر سی مثنوی «شرار عشق» کا تعارف جس میں بھوپال اور بیگم بھوپال سکندر جہاں بیگم کی تعریف و توصیف بھی ہے

بھوپال کے بابائے اردو ۔ ایم عرفان مرحوم

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۵٦، شمارہ ٦، ص ۸)

ایم۔ عرفان کے حالات زندگی اور بھوپال میں کی گئی اُن کی اردو خدمات کا تذکرہ۔

مرزا اکبر علی بیگ

پروفیسر زور کے تحقیقی مضامین

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم اور ۸ اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۵۶، شمارہ ۱۲، ۱۳، ص ۳، ۲)

زور کے تحقیقی مضامین کا جائزہ۔

مرزا حامد بیگ

شاکر الکی۔ایک گمنام صوفی شاعر

(نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۴۷، شمارہ ۱، ص ۲۵-۳۶)

بارہویں صدی ہجری کے ایک صوفی شاعر شاکر الکی کا تعارف۔ یہ ریاست سندھ خطۂ چوچھ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے عربی فارسی کے علاوہ قدیم اردو میں بھی شاعری کی ہے۔

نارنگ، گوپی چند

جدید نظم کی شعریات پر نظر ثانی

(کتاب نما نئی دہلی، مئی ۱۹۹۷ع، جلد ۳۷، شمارہ ۵، ص ۱۷-۳۲)

اردو نظم کے پس منظر میں جدید نظم پر اظہار خیال، اور اس کے عروج و زوال کی داستان۔

ندوی محسن عثمانی

اقبال اور ابو العلاء معری۔ایک تقابلی مطالعہ

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۵۶، شمارہ ٦، ص ۲-۳)

فلسفۂ خودی کے سلسلہ میں ابو العلاء معری اور اقبال کے نظریات کا مقابلہ۔

ندوی، محمد یسین مظہر صدیقی

ملفوظات اقبال کی ادبی اہمیت

(معارف اعظم گڈھ، اگست-ستمبر ۹۷ع، جلد ۱٦، شمارہ ۲، ۳، ص ۱۰۲-۱۱۷، ۱۹۴-۲۱٦)

اقبال نے نثر میں قرآنیات، سنت نبوی، اسلامی قانون، قومیت، وطنیت اور دینیت کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس کا جائزہ، دو قسطوں میں۔

نسیم انصاری

پروفیسر رشید احمد صدیقی

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ، اگست ۱۹۹۷ع، جلد ۱٦، شمارہ ۸، ص ۲-۷)

رشید احمد صدیقی کے حالات زندگی،

ذاتی مشاہدات کی روشنی میں۔

نور السعید اختر

طبعی گولکنڈوی کا تخلیقی شعور

(ہندوستانی زبان بمبئی، جولائی - ستمبر ۱۹۹۷ع، سال ۲، شمارہ ۳، ص ۱۸-۲۱)

طبعی کی مثنوی «بہرام و گل اندام» کی تخلیقی، فنی اور ادبی خصوصیات کا جائزہ

شخصیات

ابو الکلام قاسمی (مرتب)

عبد السلام نمبر

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ، مارچ ۱۹۹۷ع، جلد ۱۶، شمارہ ۳)

ڈاکٹر عبد السلام علم طبعیات کے ماہر تھے۔ سن ۱۹۷۹ع میں انہیں ان کی سائنسی خدمات کے اعتراف کے طور پر نوبل پرائز سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اس نمبر میں ان پر ۱۷ علمی مضامین ہیں، جو ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اجمل، سراج

گنو دھول - ایک تاثر

(کتاب نما نئی دہلی، اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۳۷، شمارہ ۴، ص ۶۱-۶۴)

گنو دھول، پروفیسر محمد عقیل رضوی کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ اس پر اپنا تاثر ظاہر کیا ہے۔

اختر حسین آفتاب

پروفیسر عبد السلام

(آموزگار جلگاؤں، جون ۱۹۹۷ع، جلد ۱۶، شمارہ ۶، ص ۹-۱۲)

نوبل پرائز جیتنے والے واحد مسلم سائنسداں ڈاکٹر عبد السلام کے حالات زندگی۔

انصاری طیب

محبوب حسین جگر کی یاد میں

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۵۶، شمارہ ۱۴، ص ۱ اور ۶)

جگر کی وفات اور ان کی شخصی، ادبی اور اخلاقی خوبیوں کا تذکرہ۔

خورشید ملک

تارا چرن رستوگی

(آجکل نئی دہلی، ستمبر ۱۹۹۷ع، جلد ۵۶، شمارہ ۲، ص ۳۶-۳۸)

تارا چرن رستوگی کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کا تعارف.

سالک عتیق جیلانی

ملا عبدالعلی بحر العلوم اور رامپور

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ، ستمبر ۱۹۹۷ع، جلد ۱۶، شمارہ ۹، ص ۲۳-۲۵)

فرنگی محل لکھنؤ کے علماء کا ذکر اور ملا عبدالعلی فرنگی محلی اور رامپور میں ان کے قیام کی تفصیل.

سکھ چین سنگھ

تمھاری خوبیاں زندہ، تمھاری نیکیاں باقی

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۵٦، شمارہ ۱۳، ص ۸)

جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر منظر اعظمی کی وفات. اور ان کی اردو خدمات کا جائزہ.

سید حسن عباس

وارستہ سیالکوٹی کے دو رسالے، جواب شافعی و احقاق حق

(معارف اعظم گڈھ، جون ۱۹۹۷ع، جلد ۱۵۹، شمارہ ٦، ص ۴۵۲-۴۵۷)

وارستہ سیالکوٹی کے دو مذہبی رسائل کا تعارف.

مشرقی، سید محمد حمید الدین

محترم محبوب حسین جگر مرحوم

(کتاب نما نئی دہلی، اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۳۷، شمارہ ۴، ص ۴۵-۴۹)

محبوب حسین جگر کے حالات زندگی، وہ کرناٹک رائچور کے رہنے والے تھے، وہ روزنامہ سیاست حیدرآباد کے جوائنٹ اڈیٹر تھے. جامعہ عثمانیہ میں تعلیم پائی. انھوں نے مضامین، افسانوں کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف نثر پر بھی ایک بڑا تحریری سرمایہ چھوڑا ہے.

شروانی ریاض الرحمٰن

علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت کے امتیازی پہلو

(معارف اعظم گڈھ، جون، جولائی ۹۷ع، جلد ۱۵۹، شمارہ ٦، ۷. ص ۴۰۵-۴۲۱، ۵-۱۴)

شبلی کے حالات زندگی اور ان کی

علمی، ادبی خدمات کا ذکر، ان کی انشا پردازی کی روشنی میں، دو قسطوں میں۔

عادل عثمان غنی

حضرت محمود سروش مرحوم

(کتاب نما نئی دہلی، ستمبر ۱۹۹۷ع، جلد ۳۷، شمارہ ۹، ص ۸۵-۸۷)

محمود سروش کے حالات زندگی اور ان کی علمی ادبی اور شعری خدمات کا جائزہ۔

عبید اللہ

امیر الہند نواب محمد علی خان والا جاہ

(معارف اعظم گڈھ، اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۱۵۹، شمارہ ۴، ص ۲۸۰-۲۹۲)

ریاست کرناٹک کے حکمراں محمد علی والا جاہ کے حالات زندگی اور ان کی علمی، ادبی اور مذہبی خدمات کا تعارف۔

فاروقی، شکیل اختر

ذاکر صاحب کی چھاپ

(کتاب نما نئی دہلی، مئی ۱۹۹۷ع، جلد ۳۷، شمارہ ۵، ص ۴۳-۴۶)

ذاکر صاحب کی شخصیت اور ان کی کتابوں کا ذکر جنھوں نے مقالہ نگار پر گہرا اثر چھوڑا۔

قاسمی، بدر الحسن

شیخ عبدالفتاح ابو غدّہ

ایک مامور محقق، ایک بے مثال عالم

(الفرقان لکھنؤ، مئی ۱۹۹۷ع، جلد ۶۵، شمارہ ۵، ص ۳۷)

مشہور شامی محدث و فقیہ شیخ عبدالفتاح ابو غدّہ کے انتقال پر اظہار افسوس اور ان کی خدمات کا جائزہ۔

محمد اکرام خان

ڈاکٹر ذاکر حسین۔ شخصیت کے چند نقوش

(کتاب نما نئی دہلی، مئی ۱۹۹۷، جلد ۳۷، شمارہ ۵، ص ۳۳-۴۲)

ڈاکٹر ذاکر حسین کی سیرت و شخصیت کے وہ پہلو جن سے مقالہ نگار متاثر ہے۔

محمد حنیف ملی

مولانا محمد منظور نعمانی

آغوشِ رحمت میں

(الفرقان لکھنؤ، جولائی ۱۹۹۷ع، جلد ۶۵، شمارہ ۷، ص ۱۷-۱۹)

مولانا محمد منظور نعمانی کے حالات زندگی اور اُن کی دینی خدمات کا ذکر۔

محمد زکریا ورک

محمد بن زکریا الرازی

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ، جون ۱۹۹۷ع، جلد ۱۶، شمارہ ٦، ص ۱۴۔۱۷)

الرازی قرون وسطی کے ایک ماہر فزی شین تھے، اُن کی شخصیت اور کارناموں کا حال۔

محمد مزمل محی الدین

الحاج محبوب حسین حکر مرحوم

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۵٦، شمارہ ۱۴، ص ۸)

جگر کی ادبی اور شعری صلاحیتوں کا تذکرہ۔

ملک محمد علی خان

عظیم دانش ور، اردو صحافی
اور خادم اردو
محبوب حسین جگر

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ اپریل ۱۹۹۷ع، جلد ۵٦، شمارہ ۱۴، ص ۳)

جگر کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کا ذکر۔

ندوی محمد اجتبیٰ

شہید عبدالقادر حسینی۔ فلسطین کے ایک جانباز مجاہد

(البلاغ بمبئی، مارچ ۱۹۹۷ع، جلد ۷، شمارہ ۸، ص ۲۹۔۳۱)

ایک فلسطینی مجاہد شہید عبدالقادر حسینی کے حالات زندگی۔

نذیر حسین

شیخ عبدالنبی شامی

(معارف اعظم گڈھ، ستمبر ۱۹۹۷ع، جلد ۱٦، شمارہ ۳، ص ۲۱۷۔۲۱۹)

شیخ عبدالنبی شامی کے حالات زندگی، جو گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری کے مشہور عالم تھے۔

متفرقات

اکبر رحمانی

یو پی تعلیمی کارواں نمبر (۲)

(آموز گار جلگاؤں، جنوری۔فروری ۹۷ع،

جلد ۱٦، شمارہ ۱-۲)

ڈاکٹر سید حامد کی سرکردگی میں اکبر رحمانی اور بعض دوسرے دوستوں نے یو پی کا تعلیمی دورہ کیا تھا۔ اس نمبر میں اسی دورہ کے حالات درج ہیں

انصاری ریحان

ملیریا

(البلاغ بمبئی، جون ۱۹۹۷ع، جلد ۷، شمارہ ۱۱. ص ٦۰-٦۵)

ملیریا کے متعلق طبی اور سائنسی معلومات

انصاری عبدالودود

الخوارزمی - الجبرا کا شہزادہ

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ، جولائی ۹۷ع، جلد ۱٦، شمارہ ۷، ص ۲۷-۲۸)

الخوارزمی کا تعارف، وہ مامون رشید کی قائم کردہ سائنس کی مشہور اکیڈمی بیت الحکمت کا رکن تھا اور علم ریاضی کا ماہر۔

بدر محمد بدر

انٹرنیٹ سے مسلمان کس طرح فائدہ اٹھائیں

(البلاغ بمبئی. جون ۱۹۹۷ع، جلد ۷، شمارہ ۱۱، ص ۳۱-۳۳)

انٹرنیٹ کے متعلق سائنسی معلومات.

حسن کمال

افغانستان - کچھ خواب، کچھ حقیقت

(البلاغ بمبئی، جون ۱۹۹۷ع، جلد ۷، شمارہ ۱۱، ص ۱۰-۱۲)

طالبان کا پس منظر اور مخالف طالبان قوتوں کے زوال کی کہانی.

دسنوی عبدالقوی

کتاب نما ۱۹۹٦ع کے اداریے

(کتاب نما نئی دہلی، مئی ۱۹۹۷ع، جلد ۳۷. شمارہ ۵، ص ٦۷-۷۳)

کتاب نما کے مدیر شاہد علی خان اور مکتبہ جامعہ کی علمی ادبی خدمات کا تذکرہ اور کتاب نما کے ان اداریوں کا تفصیلی جائزہ جو جنوری تا دسمبر ۹٦ع شائع ہوئے.

سید ساجد علی ٹونکی

ٹونک کی ادبی انجمنیں اور ان کی خدمات

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ جولائی ۹۷ع، جلد ۵٦، شمارہ ٢٦، ص ٢-٣)

ریاست ٹونک کی تاریخ، اس کے نوابوں کی علمی، ادبی خدمات کا تذکرہ۔

سید جعفر

قرۃ العین حیدر کا تصور وقت

(کتاب نما نئی دہلی، ستمبر ۱۹۹۷ع، جلد ۳۷، شمارہ ۹، ص ۱۱-۲۴)

وقت کے تصور سے متعلق قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" میں جو خیالات و افکار ملتے ہیں ان پر ایک بحث۔

سیما انور

جاورہ کی نثری خدمات ۔ ایک جائزہ

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ جون ۱۹۹۷ع، جلد ۵٦، شمارہ ۲۲، ص ۱۰۱)

ریاست جاورہ مالوہ کی ایک مشہور ریاست تھی، اس کے نوابوں اور ان کی اردو خدمات کا ذکر۔

شکیل الرحمٰن

دبستان اکبری ۔ رزم نامہ (مہا بھارت) کے فن کار

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ جون ۱۹۹۷ع، جلد ۵٦، شمارہ ۲۳، ص ۱، ۷)

مہاراجہ سوائی مان سنگھ میوزیم جے پور میں محفوظ مہا بھارت کے ایک مصور نسخہ کا تعارف، اکبر کی فرمائش پر نقیب خان نے اس کو فارسی میں منتقل کیا۔

شمیم منعمی

مکتوبات صدی کے نسخہ عہد مصنف کا عکسی ایڈیشن

(معارف اعظم گڈھ، مئی، جون ۱۹۹۷ع، جلد ۱۵۹، شمارہ ۵، ٦، ص ۳۷۵-۳۸۰، ۴۳۹-۴۵۰)

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات کا تعارف۔ جو ان کے مرید خاص حضرت زین بدر نے جمع کیے تھے، دو قسطوں میں۔

عابد رضا بیدار

کتاب خانہ رضائیہ رام پور

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ اگست ۹۷ع، جلد ۵٦، شمارہ ۳۲، ص ۲، ۳، ۷)

رضا لائبریری رام پور کے تعارف اور

اس کے علمی ادبی ذخائر کا جائزہ۔

عبدالجبار

عباسی عہد کا مشہور زہدیہ شاعر
ابو العتاہیہ

(معارف اعظم گڈھ، مئی، جون ۹۷ ع، جلد ۱۵۹، شمارہ ۵، ۶، ص ۳۵۵-۳۶۴، ۴۲۲-۴۳۸)

عباسی دور کے مشہور عربی شاعر ابو العتاہیہ کے حالات زندگی، اور اس کی شاعری کا تعارف دو قسطوں میں۔

عرفان احمد

قدیم بھارت کا ایک عظیم سائنس داں
آریہ بھٹ

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ، جون ۱۹۹۷ع، جلد ۱۶، شمارہ ۶، ص ۳۵-۳۸)

آریہ بھٹ کے حالات زندگی اور اُن کی منظوم تصنیف «آریہ بھٹیہ» کا تفصیلی تعارف۔

فاروقی شمس الرحمٰن

فارسی میں ہندی الفاظ

(کتاب نما نئی دہلی، ستمبر ۱۹۹۷ع، جلد ۳۷، شمارہ ۹، ص ۶۳-۶۶)

عبد الرشید کی کتاب «فارسی میں ہندی الفاظ»، پر شمس الرحمٰن فاروقی کا تبصرہ، اور موضوع کی تعریف۔

قاسمی عتیق احمد

سلطان عبدالحمید ثانی کے مظالم کے افسانے

(الفرقان لکھنؤ، اگست ۱۹۹۷ع، جلد ۶۶، شمارہ ۸، ص ۲۸-۳۳)

سلطان عبدالحمید ثانی دولت عثمانیہ کے آخری تاجدار تھے جن کی وسیع و عریض حکومت کو برطانیہ، فرانس اور روس نے سازش کر کے ٹکڑے ٹکڑے کردیا تھا۔ اُن کے خلاف اِن حکومتوں کے الزمات کا جواب۔

قیصر شمیم

دیسی نظام تعلیم کی معنویت

(کتاب نما نئی دہلی، ستمبر ۱۹۹۷ع، جلد ۳۷، شمارہ ۹، ص ۲۵-۵۶)

دیسی نظام تعلیم کی اہمیت پر ڈاکٹر قیصر شمیم کے ایک ہندی مقالہ کا اردو ترجمہ۔

گوریکر، نظام الدین ایس

صدارتی کلمات

(ہندوستانی زبان بمبئی، اپریل۔جون ۹۷ء،
سال ۲، شمارہ ۲، ص ۲۶)

مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر نے ۲۱ فروری ۱۹۹۷ء کو "ساہتیہ اور انسانیت کا سفر" پر ایک سیمینار منعقد کیا تھا۔ جس کی صدارت کے فرائض پروفیسر نظام الدین ایس۔ گوریکر نے انجام دیئے۔ اس میں انہی کے صدارتی کلمات درج ہیں۔

نجمہ صدیقہ

قطب شاہی مورخین

(سب رس حیدر آباد، اپریل ۱۹۹۷ء،
جلد ۵۹، شمارہ ۴، ص ۱۵۔۱۹)

قطب شاہی عہد حکومت کی تاریخ، اور اس دور میں مدون شدہ تاریخوں کا حال۔

نقوی نور الحسن

ہم سفر : حمیدہ اختر

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ، جولائی ۹۷ء،
جلد ۱۶، شمارہ ۷، ص ۱۲۔۱۶)

حمیدہ اختر، اختر حسین رائے پوری کی بیگم نے "ہم سفر" کے نام سے اپنی آپ بیتی لکھی ہے، یہ مضمون اسی کے تعارف پر مشتمل ہے۔

نور محمد شاہتاز

تمدن ہائے قدیم میں جرم و سزا

(معارف اعظم گڈھ، اگست۔ستمبر ۹۷ء،
جلد ۱۶، شمارہ ۲، ۳، ص ۸۵۔۱۰۱،
۱۸۳۔۱۰۳)

مشہور تمدنوں میں نظام جرم و سزا کی کیا کیفیت تھی، اس کا تفصیلی حال، خصوصیت کے ساتھ بابلی، مصری، رومی، ہندی، ایرانی، یونانی، چینی تمدنوں کا ذکر ہے۔

• • •

مودبانہ التماس

(۱) قلمکاروں سے استدعا ہے کہ وہ "نوائے ادب" کے لئے اپنے تحقیقی مضامین بھیجکر ممنون کریں، (۲) اردو اکادمیوں کے سربراہوں سے اپیل ہے کہ وہ اس تحقیقی جریدہ کو اپنے حلقہ کی لائبریریوں اور تعلیمی اداروں کو اپنی اکادمی کی جانب سے بھیجکر اردو کی سرپرستی کریں اور (۳) اردو دوستوں سے التماس ہے کہ وہ "نوائے ادب" کا سالانہ چندہ ارسال کر کے اپنی ادب نوازی کا ثبوت دیکر شکریہ کا موقع عنایت کریں.

(پروفیسر) نظام الدین ایس گوریکر
(مدیر)

مطبوعات و تالیفات

لغات گجری (مرتبہ) رقعات عالمگیر (مرتبہ) مقدمۂ رقعات عالمگیر (مولفہ) تاریخ ادب عربی (ترجمہ) برطانوی ہند کا نظام سیاسی (ترجمہ) سوراج (ترجمہ) رہنمائے صحت (ترجمہ) ترک موالات دوسرے ممالک میں (ترجمہ)	پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی
ولی گجراتی (مولفہ) نورالمعرفت (مرتبہ) غزل ولی تک (مولفہ) اردو ایسیز (مرتبہ)	ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی
اردو مراٹھی شبد کوش (مرتبہ) نوائے وقت (مولفہ) گلمپسیز آف اردو لٹریچر (مصنفہ) طوطیان ہند (مرتبہ) انڈوایران ریلیشنز: کلچرل اسپیکٹس (مصنفہ) انجمن اسلام صد سالہ تقریبات کی روداد (مرتبہ) مہاراشٹرہ میں اردو کا مقام (مرتبہ) اردو الفابیٹ اِن ٹو دیوناگری ایپی (مصنفہ)	پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
نوائے آزادی (مرتبہ) مرزا مظہر جان جاناں (مولفہ) مکاتیب مرزا مظہر (مرتبہ) مبادیات تحقیق (مولفہ) راگ مالا (مولفہ)	جناب عبدالرزاق قریشی

نقطے اور شوشے مصنفہ ڈاکٹر عابد پشاوری

مخطوطات جامع مسجد بمبئی مرتبہ ڈاکٹر حامداللہ ندوی

مقالہ نما مرتبہ محترمہ رقیہ انصاری

نوائے ادب ، بمبئی

FORM : IV – ROLL NO : VIII

Registration No. 32009/50

رجسٹریشن نمبر ۳۲۰۰۹/۵۰

مقام اشاعت : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)

نوعیت اشاعت : ششماہی

نام پرنٹر : جناب عبدالمجید پالکا ، بی کام (آنرز)

قومیت : ہندوستانی

پتہ : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)

نام پبلشر
قومیت
پتہ
ایضاً

نام ایڈیٹر : پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
ایم اے ، پی ایچ ڈی ، ڈی لٹ

قومیت : ہندوستانی

پتہ : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)

نام پتہ مالک رسالہ : ایضاً

میں عبدالمجید پالکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

عبدالمجید پالکا

• • •

All remittances be sent & correspondence be made to
Prof. N. S. Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director
Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute
92 Dadabhoy Nowroji Road, Mumbai-400 001

•

ANNUAL SUBSCRIPTION

Inland : Rs. fifty • Foreign : £ 10